یادگارِ فرحت

مرتّبہ

غلام یزدانی

مطبع انتظامی حیدرآباد دکن میں چھپا

اور

فرحت میموریل کمیٹی نے شایع کیا

۱۹۵۱ عیسوی

فرحت میموریل کمیٹی

(۱) نواب سعید جنگ بہادر (ابوسعید میرزا) — صدر

(۲) نواب محمود یار جنگ بہادر (غلام محمود قریشی)

(۳) نواب مہدی نواز جنگ بہادر (سید محمد مہدی)

(۴) محمد احمد میرزا صاحب

(۵) نواب عسکر یار جنگ بہادر (سید عسکری حسن)

(۶) سجاد میرزا صاحب — اعزازی خازن

(۷) حامد علی خاں صاحب

(۸) حبیب الرحمان صاحب

(۹) فضل الرحمان صاحب

(۱۰) پروفیسر ہارون خاں شروانی

(۱۱) ڈاکٹر یوسف حسین خاں

(۱۲) ڈاکٹر غلام یزدانی — اعزازی معتمد



MIRZA FARHATULLAH BEG

INSPECTOR-GENERAL OF COURTS, NIZAM'S GOVERNMENT

By Courtesy of Begum Farhatullah Beg

فہرست مضامین

اخباروں اور رسالوں کے تراشے

نظم

تمہید

میرزا فرحت اللہ بیگ بہت ہر دلعزیز تھے۔ جب انتقال ہوا تو مرنے کی خبر باروت کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی۔ اس سے پہلے کہ ان کا سائکل سوار میرے پاس پہنچے، ریڈیو والوں نے مجھ سے دریافت کیا، کہ آیا ان کے مرنے کی خبر صحیح ہے۔ ساڑھے نو بجے دوستوں، عزیزوں رشتہ داروں اور قدردانوں کا ایک بڑا مجمع ان کے گھر پر جمع ہو گیا۔ لیکن ان کے بڑے صاحبزادے میرزا شرافت اللہ بیگ اور منجھلی لڑکی نصرت جہاں بیگم چونکہ اس وقت حیدرآباد میں نہ تھے، اس لیے تدفین کو شام تک کے لیے ملتوی کیا گیا۔ شام کو مجمع اور بڑھ گیا اور مذہبی رسوم کو ادا کرنے کے بعد میت کو سپرد خاک کیا گیا۔ یہ ۲۷ اپریل ۱۹۴۷ء کا واقعہ ہے۔

سوم کی فاتحہ میں بھی دوست، احباب اور عزیز بہت کثرت سے شریک ہوئے اور فاتحہ کے بعد یہ قرار پایا کہ سجاد میرزا صاحب کے مکان پر ایک جلسہ ہو جس میں مرحوم کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے مناسب تجاویز سوچی جائیں۔ اس تحریک کی ابتدا نواب محمود یار جنگ بہادر (غلام محمود قریشی)، نواب مہدی نواز جنگ بہادر (سید محمد مہدی) اور سجاد میرزا صاحب کی متفقہ رائے سے ہوئی، کیونکہ ان تینوں کو فرحت مرحوم سے بے حد محبت تھی۔ قریشی صاحب تو فرحت کے شاگرد بھی ہیں اور سجاد میرزا صاحب کی مرحوم سے عزیزداری تھی۔ جلسہ ۹ مئی کو ہوا اور اس میں حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

(۱) نواب محمود یار جنگ بہادر
(۲) نواب مہدی نواز جنگ بہادر
(۳) مولوی محمد احمد میرزا صاحب
(۴) ڈاکٹر رضی الدین صاحب
(۵) مولوی فضل الرحمان صاحب
(۶) مولوی احمد حسین خان صاحب
(۷) ڈاکٹر جعفر حسن صاحب
(۸) مولوی مقصود احمد خان صاحب

(۹) میرزا عصمت اللہ بیگ صاحب (۱۰) سجاد میرزا صاحب

(۱۱) غلام یزدانی

جلسے میں مرحوم کے ادبی کارنامہ اور اردو کی قابل قدر خدمت کا ذکر ہوا اور یہ طے ہوا کہ ان کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے پانچ سو روپیہ سکہ ہند کا ایک انعام ہر سال اردو کی بہترین تصنیف یا تالیف پر دیا جائے۔ انعام کسی خاص صوبے یا ریاست کے لیے مخصوص نہ ہو بلکہ تمام ہندوستان کے اردو ادیب اور شاعر اس میں شریک ہو سکیں۔ آیندہ سال کے انعام کے لیے حاضرین جلسہ نے تقریباً پانچ سو روپیہ کی رقم فراہم کر دی اور قرار پایا کہ انعام کا فوراً اعلان کر دیا جائے۔ ساتھ ہی یہ بھی طے ہوا کہ مرحوم کے مخصوص طرزِ تحریر اور ادبی قابلیت کو ٹھیک طور سے جانچنے کے لیے ایک کتاب بھی بعنوان "یادگارِ فرحت" تالیف کرائی جائے، جس میں ملک کے صاحب فکر نقاد اور خوش ذوق ادیب مضمون لکھیں۔

فرحت مرحوم چونکہ اردو مجلس کے بھی بانی تھے اور اس مجلس سے ان کو بے حد شغف تھا، اس لیے اس اہم علمی ادارے کو بھی قایم رکھنا ضروری سمجھا گیا۔ عجیب اتفاق دیکھیے اردو مجلس کے آخری اجلاس میں جو فرحت کے مرنے سے دو روز پہلے خود ان ہی کے مکان پر ہوا، مرحوم نے سجاد میرزا صاحب کو علٰحدہ بلا کر کہا کہ بھئی مجلس کے کام کی ذمہ داری مجھ سے خاطر خواہ نہیں سنبھلتی اگر تم اپنے ذمّے لے لو تو مجھے بڑا اطمینان ہو جائیگا اور اتنا اصرار کیا اور اس محبت سے کہا کہ سجاد میرزا صاحب کو اقرار کرتے ہی بن پڑا۔ چنانچہ انعام کے متعلق جو جلسہ سجاد میرزا صاحب کے مکان پر ہوا اس میں انھوں نے یہ تحریک بھی پیش کی کہ اردو مجلس کے ارکان کا ایک اجلاس طلب کیا جائے جس میں مجلس کو جاری رکھنے کے متعلق ضروری امور طے کیے جائیں۔ اور "انعام فرحت" اور "یادگار فرحت" کے لیے چندا جمع کرنے کی سبیل نکالی جائے اور قواعد مرتب کرنے کے لیے بھی مناسب تدابیر اختیار کی جائیں۔

اردو مجلس کا یہ اجلاس ۲۷ مئی ۱۹۴۷ء کو ٹریننگ کالج کی عمارت میں ہوا اور متفقہ طور سے طے پایا کہ مجلس کو قایم رکھا جائے کیونکہ یہ بھی مرحوم کی بڑی یادگار ہے۔ فرحت مرحوم چونکہ مجلس کے اعزازی معتمد تھے، اس لیے اس سوال پر بحث ہوئی کہ اب ان کا کون جانشین ہو

سب نے کہا یہ خدمت میں انجام دوں۔

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

پنچوں کے فیصلے کو ماننا پڑا، اگرچہ مجھ کو بعض مجبوریوں کی وجہ سے قبول کرنے میں تامّل تھا اس اجلاس میں انعام فرحت کے قواعد مرتّب بھی ہوئے اور منظور بھی کیے گئے۔ "یادگار فرحت" کے لیے جن ادیبوں سے مضمون لکھوانے تھے ان کی بھی فہرست تیار کی گئی اور چندا جمع کرنے کے لیے ایک ذیلی کمیٹی مقرر کی گئی۔ ذیلی کمیٹی کے صدر نواب محمود یار جنگ بہادر اور اعزازی خازن سجاد میرزا صاحب مقرر ہوئے۔

۱۹۴۸ء کے لیے انعام فرحت کا اعلان ملک کے اخبارات اور ممتاز ادبی رسالوں میں کیا گیا۔ اور بعض ادیبوں نے استفسار بھی کیے، لیکن بعد میں ملک کی فضا کچھ ایسی تاریک ہو گئی کہ نہ چندا خاطر خواہ جمع ہوا اور نہ "انعام" کے لیے اچھی کتابیں اور مقالے وصول ہوئے حیدرآباد کچھ عرصے تک محفوظ رہا لیکن ۱۹۴۸ء میں یہاں بھی ہنگامے ہوئے اور وہ سال ادبی اور علمی کام کرنے والوں کے لیے کچھ منحوس ہی رہا۔ فرقہ واری منافرت کے علاوہ اقتصادی پستی نے بھی ملک میں بے چینی پیدا کر دی، لیکن خدا کا شکر ہے تاریک بادل اب چھٹتے جاتے ہیں اور امید کی کرنیں جھلک رہی ہیں اور آزادی جن قربانیوں سے حاصل کی گئی ہے اس کے قایم رکھنے کے لیے بلند حوصلگی، حقیقی محبّت اور رواداری کا احساس پیدا ہو رہا ہے۔

اردو زبان کی پچھلی ترقی چونکہ اس ملک کے رہنے والوں کی مشترکہ کوشش کا نتیجہ ہے۔ اس لیے آیندہ بھی وہی باہمی محبّت اور اتّفاق اور میل جول اور ذہنی رجحانات اس کی لطافت، شیرینی اور جاذبیت کے ضامن رہیں گے۔ پچھلے تیس چالیس برس کے اردو ادب پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو چکبست، فراق گورکھپوری، دیا نراین نگم، بابو رام سکسینہ، برج موہن دتاتری، پریم چند، سدرشن، اپیندر ناتھ اشک، کرشن چندر، دیوندر ستیارتھی اور راجندر سنگھ بیدی کے نام درخشاں نظر آتے ہیں۔ اردو زبان سے محبّت ان کی اپنی مادری زبان سے محبّت تھی اور یہ باقی رہیگی۔ کیونکہ آزادی پر بجا سرخوشی

اور سرمستی اس کے منافی نہیں ہے۔

فرحت مرحوم کے دوستوں میں بھی ہندو احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ چنانچہ مدرسے میں ان کے سب میں عزیز دوست بیج ناتھ تھے جو ذات کے کھتری تھے اور آگرے کے رہنے والے تھے۔ انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد بیج ناتھ آگرے چلے گئے، اور فرحت دلّی ہی میں رہے۔ لیکن کالج کی تعلیم کے زمانے میں فرحت اکثر بیج ناتھ سے ملنے آگرے جاتے آتے رہے اور شاید ملاقاتوں کا سلسلہ حیدرآباد آنے تک جاری رہا۔ فرحت میموریل فنڈ کے چندا دینے والوں میں بھی جن کی فہرست اس تمہید کے آخر میں درج ہے، ہم کو ہر ملّت اور کیش کے لوگ نظر آتے ہیں امّید ہے یہ جذبۂ یگانگت 'انعام فرحت' سے اور ترقی پائیگا اور اردو زبان کی اصلاح و ترقّی اس وسیع ملک کی آبادی کو بھائی چارے اور باہمی محبت کے رشتوں سے اور زیادہ مربوط کردیگی۔ مادری زبان کا رشتہ بڑا گہرا رشتہ ہے اور جب اوپری گرد و غبار دھل جائیگا تو باہمی دوستی اور الفت جو ایک ہی ملک میں رہنے بسنے اور ایک ہی زبان بولنے کی وجہ سے ہونی لازمی ہے نمایاں ہوجائیگی۔ فرحت میموریل کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ انعام کا انتظام مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سپرد کردیا جائے، کیونکہ علی گڑھ لکھنو اور دلّی سے قریب ہے اور حیدرآباد سے بھی اس کے گہرے تعلق ہیں۔ اردو زبان کی نشو و نما میں یہ تینوں شہر اور ان کے ملحقہ علاقے ابتدا سے اس زبان کا حقیقی معنوں میں گہوارہ رہے ہیں اور اب بھی وہاں پایے کے ادیب اور شاعر موجود ہیں۔

ملک کے جن ادیبوں کو 'یادگار فرحت' کے متعلق مضمون بھیجنے کے لیے لکھا تھا ان میں اکثر نے ہماری دعوت کو بہت خوشی سے قبول کیا۔ اور فرحت میموریل کمیٹی ان کی علمی امداد کی بے حد شکرگزار ہے۔ خود مجھ کو بڑا اطمینان اس وجہ سے ہوا کہ فرحت مرحوم کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی پڑگئی ہے اور سوائے ایک دو مضمونوں کے جن میں عبارت آرائی کی رَو میں لکھنے والے نے حقیقت کو کہیں کہیں چھوڑ دیا ہے باقی مضامین نہایت ناقدانہ اور مبالغے سے پاک ہیں۔ فرحت اللہ بیگ کے دو عزیزوں نے بھی جن سے میرا مطلب میرزا رفیق بیگ اور میرزا حسین احمد بیگ ہیں ان کی خانگی زندگی اور عادات کو نہایت صحیح طور

سے بیان کیا ہے۔ ان کے مضامین سے فرحت مرحوم اپنے اصلی روپ میں ہمیں نظر آجاتے ہیں۔ ادبی مضامین میں بھی تنقید کا معیار رعایت سے صاف ہے۔ جیسا کہ آپ کو خود مضامین کے پڑھنے سے معلوم ہو جائیگا۔

کتاب کی ترتیب میں پہلے ان کے حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں۔ پھر ان کی نثر اور نظم پر مختلف ادیبوں کے تبصرے ہیں۔ اور آخر میں اخباروں اور رسالوں کے وہ تراشے درج ہیں جن سے فرحت مرحوم کی ادبی قابلیت، عالم گیر ہر دل عزیزی اور پسندیدہ مزاح نگاری کا پتہ چلتا ہے۔ میری اور فرحت کی دوستی چونکہ بچپن سے رہی تھی اور تعلیم کے زمانے میں بھی وہ میرے ہم سبق تھے، اور ملازمت کے عرصے میں بھی سوائے سات برس کے جب میں بنگال اور پنجاب میں رہا باقی وقت ہم دونوں حیدر آباد میں ساتھ رہے اس لیے فرحت میموریل کی انتظامی کمیٹی نے مجھ سے کہا کہ اس کتاب کی تمہید میں میں بھی ایسے واقعات لکھوں جن سے ان کے کردار، عام حالات زندگی اور ادبی رجحانات پر مزید روشنی پڑسکے، چنانچہ حکم کی تعمیل میں یہ چند صفحے لکھ دئیے گئے ہیں۔

فرحت ذی قعد کے مہینے میں جس کو دلی کی عورتیں خالی کا مہینا کہتی ہیں پیدا ہوئے ہجری سال ۱۳۰۰ تھا۔ اور عیسوی سال اور مہینا ستمبر ۱۸۸۳۔ پیدائش ڈپٹی سلطان خاں کے مکان میں جس پر یہ مصرع کندہ تھا، دلکشا ہے مکان سلطان خاں، واقع ہوئی۔ یہ پہلے راجہ سیتل داس کی حویلی تھی اور غدر کی تباہی کے بعد ڈپٹی سلطان خاں۔ نے جو فرحت کے پھپا تھے اس کو خرید کر بڑے سلیقے سے درست کرایا تھا۔ اس حویلی سے متعلق ایک حمام بھی تھا اور میرے بچپن میں چوڑی والوں کے محلے کا یہ علاقہ حمام سیتل داس کے نام سے مشہور تھا۔ خود میں نے جس مکان میں نشو ونما پائی وہ اس کے مقابل تھا اور پہلے وہ راجہ بلب گڑھ کی محلسرائے تھا۔ غدر کے بعد ہمارے بزرگوں نے اس کو خرید لیا تھا۔ ان دونوں مکانوں کے قرب کی وجہ سے میں اور فرحت شیر خوارگی کے زمانے میں بھی ساتھ کھیلے ہوں تو تعجب نہیں۔ اس میل جول کی وجہ مکانوں کے قرب کے علاوہ ایک یہ بھی تھی کہ فرحت کی چھوٹی پھپی میرے حقیقی چچا کو بیاہی ہوئی تھیں اور ان کی اولاد تو فرحت کے

پھپی زاد بھائی بہن تھے میرے چچا زاد بھائی بہن ہوتے تھے۔ ہماری دوستی اور آپس کی محبت کو اس عزیزداری نے اور گہرا کردیا تھا۔ چنانچہ جب ذرا ہوش آیا تو میرے عم زاد بھائی فصیح الدین اور فرحت یا تو سارے دن اور پہر رات گئے تک ہمارے مکان میں رہتے تھے یا میں ان کے مکان میں رہتا تھا۔ مکانات کے صحن بہت وسیع تھے۔ یہیں ہمارے ابتدائی زمانے میں مکتب رہے اور یہیں ہم نے کوڑی ذقن، کبڈی، گلّی ڈنڈا، گولیاں کھیلیں اور پتنگ اڑائے اور یہیں اپنے اکھاڑے میں کثرت اور لڑنت بھی کی اور انگریزی کھیل کرکٹ اور ٹینس بھی سیکھے۔ دسویں پندرھویں دن چھٹی کے روز ٹورنامنٹ بھی ہو جاتی تھی۔ جس میں بھاگ دوڑ، کودنے پھاندنے اور رسہ کشی کے مقابلے ہوتے تھے۔ ہم جماعت مدرسے کے طالب علم بھی اس میں شریک ہوجاتے تھے۔ فرحت کا شوق ان سب کھیلوں اور ورزشوں میں حقیقی تھا، لیکن ان کی کوئی نمایاں حیثیت نہ تھی جیسا کہ ان کے پھپی زاد بھائی فصیح الدین نے شروع سے حاصل کرلی تھی۔ کالج میں پہنچ کر البتہ فرحت نے گیند پھینکنے میں نام پیدا کیا اور تیرنے میں وہ اپنے دوستوں سے سبقت لے گئے۔ اس کا تفصیلی ذکر آگے چل کر کیا جائیگا۔

فرحت کا رنگ نہایت سرخ و سپید، جلد صاف، ہونٹ پتلے پتلے، دانت چھوٹے اور پیوستہ، چہرہ نہ لمبا نہ زیادہ گول، آنکھیں البتہ چھوٹی چھوٹی، اور ایک آنکھ کو دبا کر دیکھتے تھے۔ گھر کی بڑی بوڑھیاں کہتی تھیں کہ ان کو یہ عادت خواجہ امیرالدین کو دیکھ کر پڑگئی تھی، جن کی بھی آنکھیں چھوٹی تھیں اور ایک آنکھ دبا کر دیکھتے تھے۔ خواجہ امیرالدین خواجہ امان مترجم بوستان خیال کے پوتے تھے اور فرحت کا ان سے ننھیالی اور ددھیالی دونوں طرف سے قریبی رشتہ تھا۔ فرحت بچپن میں بہت دبلے تھے اور جوانی اور بڑھاپے میں بھی بدن چھریرا رہا۔ لیکن پچھلی عمر میں پیٹ ذرا بڑھ گیا تھا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے پیٹ پر پھیرتے تھے اور کہتے تھے "دانی! دیکھ میری اب تو ندنکل آئی ہے۔"

فرحت کا خاندان شاہ عالم ثانی کے زمانے میں ترکستان سے ہندوستان آیا۔ ان کا شجرۂ نسب مضامین فرحت حصہ چہارم میں درج ہے۔ لیکن میں ایسے شجروں کو تاریخی اہمیت نہیں دیتا۔ اور غلام رسول مہر ناحق الجھن میں پڑے جب انھوں نے

غالب کے بعض بیانات اور فرحت کے دیے ہوے خاندانی حالات میں فرق پایا[1]۔ دلّی کے شرفا میں شجرے رکھنے اور بنانے کا ایک مجنونانہ شوق پیدا ہوگیا تھا اور عرصے سے چلا آرہا تھا۔ نادر شاہ کے متعلق آپ لطیفہ سن چکے ہونگے کہ جب دلّی والوں نے اپنی تعلّی میں اس کے نسب کا حال پوچھ کر اس کو ذلیل کرنا چاہا، تو اس نے نادر ابن شمشیر ابن شمشیر سات پشت تک شمشیر کا سلسلہ سنا کر خود دلّی والوں کو قایل کر دیا۔ خیر اس شجرے کے مرض کا ایک واقعہ مجھ سے بھی سن لیجئے۔ میرے دفتر کے ایک نقشہ نویس اور پیمایش کے ماہر سلطان علی فاروقی تھے مراد آباد کے رہنے والے تھے اور اچھے خاندان سے تعلّق رکھتے تھے ان کے آباد اجداد کا ذکر مراد آباد ضلع کے گزیٹیر میں بھی درج تھا۔ یہ اپنا شجرہ ہمیشہ جیب میں رکھتے تھے جس میں سلسلۂ نسب حضرت نوح سے گزر کر حضرت آدم تک درج تھا۔ کچھ زمانے تک سلطان علی بیدر میں متعین رہے اور جب کبھی کوئی معزز سرکاری مہمان یا بڑا سرکاری عہدہ دار بیدر جاتا تھا یہ اپنا شجرۂ نسب اس کو ضرور دکھایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ نواب اختر یار جنگ (لطیف احمد مینائی) جو اس وقت معتمد محکمہ امور مذہبی تھے میرے ساتھ دورے پر بیدر گئے۔ سلطان علی ان کو شجرہ دکھانے کے لیے بیتاب ہوگئے۔ لیکن میری وجہ سے ذرا تامّل کیا۔ پھر مجھ سے اجازت مانگی کہ اپنا شجرۂ نسب مینائی صاحب کو دکھادوں، میں نے کہا ضرور دکھائیے۔ اجازت ملتے ہی سلطان علی نے شجرہ پیش کیا۔ مینائی مرحوم بہت متین تھے لیکن ساتھ ہی طبیعت شگفتہ پائی تھی۔ شجرے کو اول سے آخر تک پڑھا، اور پھر کہا سلطان علی صاحب میں آپ کو آپ کی عالی نسبی پر مبارکباد دیتا ہوں، افسوس ہے میرا شجرۂ نسب میرے ساتھ نہیں ہے لیکن آپ کو یقین دلاتا ہوں، کہ میں شیطان کی اولاد میں نہیں ہوں اور میرا شجرۂ نسب بھی حضرت آدم تک پہنچتا ہے۔

فرحت مرحوم کے ٹھیٹھ مغل ہونے کی دلیل تو ان کا چہرہ مہرہ اور رنگ تھا۔ ان کے چچا علی میرزا بیگ کی آنکھیں کرنجی، بال بھورے اور گلوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں اور

---

[1] ملاحظہ ہو غالب نمبر علی گڑھ میگزین بابتہ سنہ ۱۹۵ء۔

یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی ترکستان سے آئے ہیں۔ ان کی نانی انجمن آرا بیگم کے چہرے کی وضع بھی خالص مغل عورتوں کے چہرے کی سی تھی۔ فرحت کی والدہ مشرف جہاں بیگم کا انتقال چونکہ ان کی صغر سنی میں ہو گیا تھا اس لیے میں نے ان کو نہیں دیکھا البتہ فرحت کے والد میرزا حشمت اللہ بیگ بہت شکیل اور خوبصورت تھے اور اپنے سب بھائیوں میں زیادہ وجیہ تھے۔ فرحت کے دادا صاحب میرزا عبداللہ بیگ چونکہ افلاس کی لپیٹ میں آگئے اس لیے فرحت کے چچاؤں اور والد کی تعلیم خاطر خواہ نہیں ہوئی البتہ ذہین سب تھے اور شاعری کی طرف میلان رکھتے تھے۔ فرحت کی والدہ کے انتقال کے بعد ان کی پھپی حسن جہاں بیگم نے ان کو پالا۔ یہ بڑے حوصلے اور نیک کردار کی خاتون تھیں۔ سب بھائیوں اور ان کی اولاد کی مدد کرتی تھیں اور اپنی زندگی نہایت سادگی سے بسر کی۔ فرحت کی تعلیم کا ان کو بڑا خیال تھا۔ بسم اللہ ہوتے ہی قران پڑھانے اور ضروری ابتدائی دینی مسایل سکھانے کے لیے حافظ قاسم رضا صاحب کو ان پر مقرر کر دیا۔ حافظ صاحب صورت شکل کے بھی وجیہ تھے اور سیرت کے بھی نہایت نیک۔ گھر کی مکتبی تعلیم کے بعد شاہ جی کے چھتے کے مدرسے میں جہاں میں بھی پڑھتا تھا فرحت داخل ہو گئے۔ اس زمانے میں مدرسے کی تعلیم کے ساتھ ساتھ زبان اور ابتدائی مذہبی تعلیم کو بھی شریف گھرانوں میں ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ کیونکہ والدین سمجھتے تھے کہ مدرسے کے لڑکوں میں اوّل تو آخور کی بھرتی ہوتی ہے جن کے اخلاق اور بول چال اچھی نہیں ہوتی۔ دوسرے استاد بھی کم تنخواہ یاب ہونے کی وجہ سے مہذّب اور غیور نہیں ہوتے۔ مجھ کو پڑھانے کے لیے اس زمانے میں ایک مولوی الٰہ بخش نامی آتے تھے۔ فرحت بھی میرے ساتھ ان کے درس میں شریک ہو گئے! اور وہ شوخی اور شرارت جس کو انھوں نے اپنے مضمون 'یادِ ایامِ عشرتِ فانی' میں اپنی طرف منسوب کیا ہے ہرگز نہیں تھی البتہ ان کی سادگی، بھولپن، اور ذہانت کی وجہ سے سب طالب علم اور استاد ان کو عزیز رکھتے تھے۔ شاہ جی کے چھتّے کا مدرسہ اپر پرایمری سکول تھا۔ فرحت جب اس مدرسے کی تعلیم سے فارغ ہوے تو وظیفہ لے کر نکلے۔ وسطانیہ اور فوقانیہ تعلیم کے لیے اس وقت کشمیری دروازے کا مدرسہ سب میں بہتر تھا۔ یہ اس عمارت میں واقع تھا جس میں غدر سے پہلے کسی زمانے میں

رزیڈنسی تھی اور بعد میں دلّی کالج بھی وہاں رہا۔ بڑے بڑے عالیشان کمرے اور کھیلنے کے لیے وسیع میدان اور پانی کے حوض جس میں نہر سے پانی آتا تھا۔ شہر کی فصیل اور کیلا گھاٹ دروازہ بھی قریب تھے جہاں سے دریا (جمنا جی) کو راستہ جاتا تھا۔ طالب علموں کے دل پر ایسے تاریخی مقامات اور قدرتی مناظر کا بڑا اثر ہوتا ہے! وروسیع نظری کے علاوہ وطن کی محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ فرحت کی مقبول نظم 'جمنا کا کنارا' انہی تاثرات کا نتیجہ ہے جو ان کے دل پر مدرسے اور کالج کی تعلیم کے زمانے میں ہوئے۔ فرحت کو اس مدرسے میں ذہنی تربیت بھی حاصل ہوئی اور جسمانی بھی۔ مدرسے کی کرکیٹ ٹیم میں وہ اچھے کھلاڑی شمار ہونے لگے اور انٹرنس کا جب امتحان پاس کیا تو اول درجے میں پاس ہوئے اور ایک چاندی کا تمغا بھی حاصل کیا۔ فرحت نے "یاد ایام عشرت فانی" کے سلسلے میں اپنے مدرسے کے استادوں کی کمزوریوں کو نہایت پر لطف طور سے بیان کیا ہے۔ ان کے بیان میں مبالغہ ضرور ہے لیکن جن کمزوریوں کو انھوں نے نمک مرچ لگا کر بیان کیا وہ ان استادوں میں موجود تھیں۔ اس ضمن میں اتنا کہنا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ سب استاد اپنے اپنے مضمون کے فاضل اور صاحب کمال تھے اور باوجود ان کی بعض عادات کے مضحکہ خیز ہونے کے ان کے علمی تبحر کا ہم پر بڑا اثر ہوتا تھا۔ اور اسی وجہ سے ہم ان کا بڑا ادب اور احترام کرتے تھے۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں فرحت کالج میں پہنچے۔ ہندو کالج نیا نیا قایم ہوا تھا۔ اس کی فیس بھی بہت کم تھی، یعنی صرف دو روپیہ ماہانہ، اور چونکہ یہ ماسٹر پیارے لال (رائے بہادر) کی خاص کوشش سے قایم ہوا تھا اور ان کا پوتا ہر چند جو فرحت کا اسکول میں ہم جماعت تھا وہ بھی اس کالج میں داخل ہوا، اس لیے کفایت، قومی حمیت اور دوستوں کی پاسداری سے یہ بھی کالج میں داخل ہو گئے۔ یہ کالج اس وقت کناری بازار کے ایک مکان میں تھا۔ خود کناری بازار نہایت تنگ اور کثیف ہے۔ کالج کی عمارت بھی چھوٹی تھی۔ صحن مختصر تھا اور لڑکے یا ڈیوڑھی میں بیٹھے رہتے تھے یا پاس کی دو کانوں کے آگے کے تختوں پر۔ جب کالج قایم ہوا تھا اس وقت تو بہت دھواں دار تقریریں ہوئی تھیں اور بڑے بڑے چندوں کے وعدے بھی ہوئے۔ لیکن قومی تحریکوں کے لیے وہ ابتدائی زمانہ تھا

اس لیے کالج کے اخراجات کا سارا بوجھ رائے بہادر سری کرشن داس پر پڑ گیا۔ ان کا خاندان گوڑ والوں کے نام سے مشہور تھا۔ سری کرشن داس بڑے حوصلے کے آدمی تھے اور اگر ان کے ساہوکارے کو زوال نہ آتا تو وہ اکیلے کالج کے اخراجات کا بوجھ سنبھال لیتے لیکن کاروبار کے بگڑنے کی وجہ سے وہ کافی مدد نہ دے سکے۔ استادوں کی تنخواہ بہت کم تھی، عملہ بھی بہت کم تھا، اس لیے اچھے استاد ٹک نہ سکے۔ اور جو ٹکے وہ بہت معمولی قابلیت کے تھے۔ ایک استاد رے Ray نامی تھے۔ تاریخ بھی پڑھاتے تھے، ریاضی بھی اور کیمیا اور طبیعیات بھی۔ فرحت انجینئر بننا چاہتے تھے اور انھوں نے نقشہ کشی کا کام اپنے بہنوئی (پھپھی زاد بہن کے خاوند) سید محبّت حسین سے بہت شوق سے سیکھا تھا تاکہ آیندہ انجینری کی تعلیم میں ان کے کام آئے۔ فرحت ریاضی میں بھی ہوشیار تھے لیکن رے صاحب کی بے توجہی اور کم علمی سے ان کو ریاضی اور سائنس میں پاس ہونا ہی دشوار ہو گیا! ور وہ ان مضمونوں سے ایسے گھبرا گئے کہ بی۔ اے میں انھوں نے میرے کہنے سے عربی لے لی جو پہلے کبھی نہ پڑھی تھی۔

فرحت کی موزونیٔ طبع کالج میں چمکنے لگی اور مدرسے میں جو شرمیلاپن تھا وہ جاتا رہا۔ ہم جماعتوں پر پھبتیاں کسنی شروع کر دیں۔ ایک لڑکا بشمبر دیال تھا۔ اپنے کو بی دیال لکھتا تھا۔ مزاج کا چڑچڑا تھا۔ طالب علموں کو یہ کمزوری ہاتھ لگ گئی۔ اس کا نام کرک بی رکھ دیا۔ فرحت نے قصیدہ لکھا۔ مجھے اس مزخرفات کے تین شعر یاد رہ گئے ہیں لکھے دیتا ہوں۔ فقط فرحت کا ہجو کی طرف میلان دکھانا منظور ہے۔

ہر اک اس کی مدحت میں حیران ہے — جو دیتا طبیعت کو جولان ہے
اگر نام پوچھو تو ہیں بے شمار — کرک بی، چُغد[1]، اور دستان ہے
دہن خم ہے آنکھیں ہیں بھینگی ذرا — اور ابرو تو بس کفش لفغان ہے

---

[1] صحیح لفظ چُغد ہے سے چُغد نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب۔ لیکن دلّی والے عام روزمرّہ میں بیوقوف کو چُغد اور چُغت بولتے ہیں۔

لڑکے تو لڑکے استاد بھی فرحت کی موزونیٔ طبع سے نہ بچے۔ فارسی کے استاد پہلے مولوی امیر حمزہ تھے وہ اللہ والے لوگ تھے۔ رات کو پیر نے بشارت دی کہ نوکری چھوڑ دو۔ انھوں نے صبح کو آکر استعفا پیش کر دیا۔ کالج کی انتظامی کمیٹی نے ایک اور صاحب کو جو پنجاب یونیورسٹی کے منشی فاضل تھے مولوی امیر حمزہ کی جگہ مقرر کر دیا۔ ان صاحب کی پہلے کناری بازار ہی میں صرافے کی دوکان تھی۔ پرانا گوٹا مسالا بھی خریدتے تھے اور لڑکے آتے جاتے دیکھتے تھے کہ یہ تھال میں پرانا مسالا لیے بیٹھے ہیں اور آگ کو پھونک رہے ہیں تاکہ مسالا جل کر چاندی بن جائے۔ خالی وقت میں اکثر دوکان پر مثنوی مولانا روم اور دیوان حافظ بھی جھوم جھوم کر پڑھا کرتے تھے، چنانچہ لڑکے ان کے پیشے اور شوق سے واقف تھے۔ جب کالج میں پہنچے تو کسی ظریف طبع دیہاتی لڑکے نے ان کا نام "طبلۂ غازی" رکھ دیا۔ طالب علموں کو یہ بہت پسند آگیا۔ فرحت نے مرثیے کے طرز میں اس لقب کو اور مقبولیت دیدی۔

سینگ کٹا کر بچھڑوں میں آیا طبلۂ غازی واویلا
ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ وارے مداری واویلا

پنڈت ہرنراین شاستری جو کالج میں بہت زمانے تک رہے اور بعد میں علم و فضل کی وجہ سے مہامہوپادھیا بھی ہو گئے، سنسکرت پڑھاتے تھے۔ صبح کو جو پرارتھنا ہوتی تھی اس کا انتظام بھی انہی کے سپرد تھا۔ یہ بنارس کے رہنے والے تھے سنسکرت الفاظ کو خصوصاً جن میں ڑ اور ڈ نون غنہ کے ساتھ ہوں نہایت صحت سے ادا کرتے تھے۔ فرحت بھی پیچھے کی نشستوں سے پرارتھنا کو سنتے تھے اور اپنے حافظے کے زور سے ساری پرارتھنا کو اول سے آخر تک یاد کر لیا پھر لڑکوں کو جماعت سے باہر آکر پرارتھنا کو سنایا۔ ان کو بڑا اچنبھا ہوا، کیونکہ فرحت سنسکرت سے بالکل ناواقف تھے۔ شدہ شدہ پنڈت جی کو خبر ہوئی ان کو بھی تعجب ہوا اور فرحت کو بلا کر پرارتھنا سنی۔ جب انہی کے لب و لہجے میں سنائی گئی تو پنڈت جی بہت خوش ہوے اور فرحت کو اشیرباد دی۔ یہ بھی میں ذکر کیے دیتا ہوں کہ فرحت نے سینٹ سٹیفنز کالج میں پہنچ کر قراءت Elocution کا انعام حاصل کیا۔

فرحت کی ہر دلعزیزی کھیل کے میدان میں ان کی بے تکلف باتوں اور رویے سے

اور بڑھی۔ ہم دونوں اور کالج کے کچھ اور طالب علم جو ہمیشہ سے کرکیٹ اور فٹ بال کے ولدادہ تھے کالج کے پرنسپل کے سر ہوئے کہ ہمارے واسطے کھیل کے میدان کا ضرور انتظام ہونا چاہیے۔ چنانچہ کالج کی انتظامی مجلس نے کوشش کر کے دلّی چھاونی کے عہدے داروں سے پیپلز پارک Peoples Park میں طالب علموں کے کھیلنے کے لیے اجازت حاصل کر لی۔ یہ میدان ٹھنڈی سڑک کے غربی جانب پن چکی کی ڈھلان کے قریب واقع ہے۔ شمال میں پہلے نہر بہتی تھی جسے اب پاٹ دیا گیا ہے۔ جنوبی جانب ایک بڑا کنواں ہے جو 'پتھر والے' کے نام سے مشہور تھا اور گرمیوں میں اس پر پانی بھرنے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔ کیونکہ اس کا پانی بہت شیریں، ہلکا اور ٹھنڈا ہوتا تھا۔ پاس ہی املی کے درختوں کا وہ جھنڈ تھا جس کے نیچے ۱۸۵۷ء کے فساد کے بعد پھانسی گڑھ گئی تھی اور فوجی عہدے دار نوجوان اور شریف گھرانے کے لوگوں کو محض مخبری کی بنا پر رسمی پوچھ گچھ کے بعد پھانسی پر لٹکا دیتے تھے۔ ہمارے خاندان کے بعض افراد بھی یہاں مارے گئے۔

پیپلز پارک میں مشق کرنے کے بعد کرکیٹ اور فٹ بال دونوں میں ہندو کالج کے طالب علموں نے خاصا نام پیدا کر لیا۔ سینٹ سٹیفنز کالج والوں سے اکثر مقابلہ ہوتا تھا ہارتے بھی تھے اور جیتتے بھی۔ فرحت فٹ بال کھیلتے تھے، لیکن کرکیٹ سے ان کو زیادہ شوق تھا اور اچھی گیند پھینکنے لگے تھے۔ اس زمانے میں ہماری ٹیم کے گیند پھینکنے والوں میں درگا داس پوری اور امیر چند زیادہ ممتاز تھے۔ درگا داس کی گیند بلا کی تیز تھی اور سیدھی وکٹوں میں جاتی تھی اور جن کھلاڑیوں کی نظر زیادہ تیز نہیں تھی وہ اکثر ان کی گیند کا شکار ہو جاتے تھے۔ امیر چند کی گیند میں بریک Break بھی تھا اور ٹپے Pitch بھی اچھے پڑتے تھے۔ ان کو لڑکے خبر نہیں کیوں امیر چند ڈھانڈا کہتے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور ذرا ابلی ہوئی، رنگ سیاہ فام، بدن کسرتی کیونکہ کشتی کا بھی شوق تھا۔ گیند دیتے وقت بیچ کی انگلی اور اس کے برابر کی انگلی کو زبان سے چاٹ کر گیند کی سیون کے پاس رکھ کر پھر پھینکتے تھے یہ عمل ہر مرتبہ ہوتا تھا۔ ایسی حرکتیں بعض کھلاڑی کرتے ہیں۔ ہاں میرے اور فرحت کے کھلاڑیوں میں سے چند بہت گہرے دوست بن گئے تھے جن کی دوستی

تمام عمر قایم رہی اور جن کی دوستی پر ہم کو فخر ہے - ہر چند جو بعد میں دہلی بسکٹ فیکٹری کے جنرل نیجر ہو گئے - پران کرشن جن کے ایک صاجزادے پریم کرشن آئی - سی - ایس ہیں اور دوسرے آج کل کی ایڈمنسٹریٹو سروس میں ہیں - سربکشن جو خود اب بیرسٹر ہیں اور ان کے ایک صاجزادے حال میں گرداسپور کے ڈپٹی کمشنر تھے - دھنی چند یہ تجارتی کاروبار کرتے ہیں اور پہلے لاہور میں ان کا موٹروں کا بڑا بیوپار تھا - محمد شفیع یہ ریاست سیکھر (علاقہ جے پور) میں کسی اچھے عہدے پر فائز تھے - اعجاز حسین ان کا کلکتے میں بیوپار تھا اور اب انتقال ہو گیا ہے اور فصیح الدین میرے عمزاد اور فرحت کے پھپی زاد بھائی، جو دلّی چھوڑ کر حیدر آباد آئے تو منصف ہو گئے اور اب وظیفہ لے لیا ہے - ہندو کالج میں اس زمانے میں کچھ اور طالب علم بھی ایسے پڑھتے تھے جنھوں نے بعد میں بڑا نام پیدا کیا مثلاً سری رام، جو بعد میں سرسری رام ہوئے اور دلّی کلاتھ مل اور بہت سی گرنیوں (ملوں) کے مالک ہیں - فرحت کی ان سے معمولی راہ و رسم تھی لیکن جب وہ چند سال ہوئے حیدر آباد آئے تو غلام محمد صاحب سے کہا میں فرحت سے ملنا چاہتا ہوں اور بڑی محبت اور تپاک سے ملے - ۱۹۰۳ء میں فرحت انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد سینٹ سٹیفنز کالج میں داخل ہوئے یہاں کی فضا اس وقت ذہنی، اخلاقی اور جسمانی تربیت کے لیے بہت اچھی تھی - پادری ڈے اور اینڈروز اس وقت کالج میں پروفیسر تھے - اینڈروز نے جو خدمت ملک کی کی ہے وہ تو اس صدی کے پچھلے چالیس برس کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہیگی - پادری ڈے بہت اچھے مقرر تھے اور کیمبرج کی یونیورسٹی کی کرکیٹ ٹیم میں اپنے زمانے کے بہترین کھلاڑی شمار کیے جاتے تھے - یہ بڑے باپ کے بیٹے تھے - ان کے والد کلکینی Kilkenny کے بشپ تھے اور ڈے صاحب بھی جب خرابی صحت کی وجہ سے ہندوستان سے ولایت واپس ہو گئے تو بشپ ہو گئے اور رفتہ رفتہ تمام آئرلینڈ کے لاٹ پادری Primate بن گئے - پرائمیٹ کا مرتبہ اور عزت آئرلینڈ میں وہی ہے جو انگلستان میں کنٹربری کے لارڈ بشپ کو حاصل ہے - ان دونوں استادوں کو فرحت کی ذہانت، سادگی اور کرکیٹ کے شوق کی وجہ سے بے حد جنّت ہو گئی - ۱۹۳۹ء عیسوی

میں فرحت اور میں دونو سینٹ سٹیفنز کالج کی ری یونین Re-Union میں شریک ہوئے۔ اس روز رات کے کھانے کے بعد پادری سی۔پی ینگ نے اپنی تقریر میں فرحت کے طالب علمی کے زمانے کے ایک واقعہ کا ذکر نہایت لطیف انداز میں کیا۔ کالج کی ٹیم کا انگریز عہدہ داروں کی ٹیم سے جس میں فوجی اور سیول افسر دونوں شامل تھے میچ ہو رہا تھا۔ کالج نے اپنی باری میں دو سو کے قریب دوڑیں بنائی تھیں لیکن انگریزی ٹیم Stationers کے چھٹے اور ساتویں کھلاڑی ایسے آکر جمے کہ اسکور ۱۰۰ سے اوپر ہو گیا۔ کالج کی ٹیم کے ہاتھ پیر دوڑتے دوڑتے ڈھیلے پڑ گئے اور جیتنے کی آس نہ رہی۔ فرحت نے جب یہ حال دیکھا تو للکار کر کہا Lift up your hearts, comrades اور جوش میں اپنا روپ سول کر مس Canvas کا جوتا بھی اتار کر پھینک دیا اور اس کمال اور زور سے گیند پھینکی کہ ایک ہی اُوور Over میں تین کھلاڑیوں کو پے در پے خارج Out کیا اور ٹوپی جیتنے کا کارنامہ Hat trick انجام دیا۔ بلند اقبال اور حسین میرزا نے ان کو کندھے پر بٹھا لیا۔ اینڈروز نے پویلین کو اپنی تالیوں اور تعریف کے نعروں سے گونجا دیا۔ یہ میچ ۱۹۰۲ء میں ہوا تھا اس وقت بلند اقبال ٹیم کے کپتان تھے۔ مجھ کو اور فرحت دونوں کو تعجب یوں زیادہ ہوا کہ پادری سی۔پی۔ ینگ کو یہ چھتیس برس کی بات کیسے یاد رہی فرحت کرکٹ کے میچوں میں بھی فلالین کی پتلون اور ٹوبل کی قمیص کم پہنتے تھے۔ ڈھیلا ڈھالا ململ کا کرتا جو گھٹنوں تک پہنچتا تھا اور گریبان میں گلے کے گرد ایک ڈیڑھ انگل کی پٹی ہوتی تھی اور لٹھے کا چوڑے پائینچوں کا پائجامہ۔ سوٹ سے کچھ نفرت سی رہی۔ ایک دفعہ اعجاز حسین نے کلکتہ بلایا اور شرط یہ کی کہ سب سوٹ پہن کر آئیں ان کے انگریز دوست بہت تھے۔ گھوڑ دوڑ Races کا زمانہ تھا۔ وہ لوگ ہندوستانی کپڑے والوں کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ فرحت نے بھی بجبر و قہر سوٹ سلوائے۔ جامہ زیب تھے۔ اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی سوٹ کی تصویر اور بچپن کی تصویر اس کتاب میں شامل ہیں آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ لباس میں سادگی کی وجہ سے بنیان سے بھی چڑ تھی۔ کہتے تھے میرے چھتا ہے اور بدن سے چونکہ بنیان چپکا رہتا ہے اس لیے اس کے پہننے سے میرا جی



گھبراتا ہے۔ دلّی میں جب جاڑوں میں سردی زیادہ پڑنے لگتی تھی تو یہ پھولدار مرینے کی جس میں روئی بھری ہوتی تھی اور لوزات کے نگندے ہوتے تھے پہن لیا کرتے تھے۔ اس پر صبح اور شام کے وقت اُووَرکوٹ Overcoat ۔

میں فرحت کی کالج کی زندگی کا ذکر کر رہا تھا۔ جماعت میں بھی ان کے استاد ان کی ذہانت سے بہت خوش تھے۔ تاریخ کی تحقیق میں انھوں نے ہارکورٹ پرائز Harcourt Prize حاصل کیا۔ مضمون کا عنوان تھا بڑی بوڑھیوں سے سنے غدر ۱۸۵۷ء کے حالات کیمبرج یونیورسٹی کے زیر اہتمام ایک انجیل کا امتحان بھی ہوتا تھا۔ فرحت اس کے مقابلے میں بھی اول آئے اور انعام حاصل کیا۔ فارسی ہم کو مولوی میر شاہجہاں صاحب پڑھاتے تھے۔ علم و فضل کے ساتھ یہ نہایت مہذب، پابند وضع اور ذرا نازک مزاج بھی تھے۔ ایک دن حدایقۃ البلاغت پڑھا رہے تھے اور ذو معنین کی تشریح ہو رہی تھی۔ فرحت کی طبیعت میں رکا و کم تھا۔ مولوی صاحب کا بیان ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ فرحت نے یہ شعر بے دھڑک پڑھا

زبان آں پسر ترکی و من ترکی نمی دانم
چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہان من

مولوی صاحب کو طیش آگیا اور فرمایا کہ جب بزرگوں کے سامنے بات چیت کیا کرو اور پڑھا کرو تو ان کے وقار اور آدابِ مجلس کا خیال رکھا کرو۔ فرحت کی یہ کمزوری ہمیشہ رہی اور موقع و محل کو کم دیکھتے تھے اور جب منہ پہ کوئی بات آجاتی تھی تو فوراً کہہ دیتے تھے جس سے بعض لوگوں کو ان کی یہ بیباکی ناگوار گزرتی تھی۔

فرحت نے بی۔ اے کا امتحان ۱۹۰۵ء میں اچھے نشانات سے پاس کیا اور ایم۔ اے کی تعلیم سینٹ سٹیفنز میں ہی شروع کر دی۔ پڑھائی کے اخراجات بڑھے۔ اور ان کے والد کی لااُبالی باتوں نے گھر کی آمدنی کو کم کر دیا۔ گانو کی ساری آمدنی میرزا حشمت اللہ بیگ اپنے واہیات شوقوں میں خرچ کر دیتے تھے۔ بہن (حسن جہاں بیگم) اف نہ کرتی تھیں۔ تھوڑی بہت جائداد جو چھوٹے مکانوں اور دو کانوں کی صورت میں تھی اس سے گھر چلتا تھا۔ غرض فرحت کے لیے یہ سختی کا زمانہ تھا۔ مولوی نذیر احمد صاحب سے کچھ قرض مانگا۔ انھوں نے سود

زیادہ مانگا۔ پادری ڈے نے کچھ مدد کی لیکن فرحت کی غیور طبیعت اس مدد کو زیادہ گوارا نہ کر سکی اور آخر میں انھوں نے ایم۔ اے کے دو سال کے کورس کو دس مہینے میں پورا کیا اور امتحان میں شریک ہوے لیکن ایک دو پرچوں میں ناکامیاب رہے۔

۱۹۰۶ء سے ۱۹۰۷ء تک فرحت دلی ہی میں رہے۔ اس عرصے میں کھیل کود اور یار دوستوں سے میل جول کی خاطر پہلے ایک خانگی ٹینس کلب پن چکّی کی ڈھلان کے دائیں جانب جہاں سے ایک دھرم سالے کو بھی راستہ جاتا ہے قایم کی۔ یہاں کالج کے سب دوست جمع ہو جاتے تھے اور شام کو خوب غپ شپ رہتی تھی۔ کرکٹ میچوں کے پروگرام بنتے تھے ڈراموں کے سٹیج کرنے کی تیاریاں ہوتی تھیں۔ فرحت چونکہ کالج کی تعلیم کے آخری زمانے میں کرکٹ ٹیم کے کپتان بھی ہو گئے تھے اور وہاں کی ڈرامیٹک ایسوسی ایشن کے روح رواں تھے اس لیے ان کی ہدایت اور مشورے کی بڑی قدر ہوتی تھی۔ خود فرحت کی اداکاری میں نمایشی اثر ہوتا تھا۔ لیکن دوسرے اداکاروں کے لیے جو ذرا سست ہوتے تھے یا جن میں جھجک ہوتی تھی وہ اچھے استاد تھے۔ فرحت کا یہ شوق حیدر آباد آنے کے بعد بھی قایم رہا۔

فرحت نے تیرنا تو ہندو کالج کی طالب علمی کے زمانے ہی میں سیکھ لیا تھا۔ لیکن بعد میں حکیم اعجاز الدین کی رفاقت میں یہ شوق اور بڑھا اور کبھی کبھی جمنا پر جب برسات میں پانی زوروں پر ہوتا تھا مجھ کو اور چند دوستوں کو ساتھ لے جایا کرتے تھے اور اپنا کمال دکھاتے تھے۔ ہم لوگ کنارے ہی پر ہاتھ پیر مار لیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ بڑا لطف ہوا۔ پیلیز پارک میں فٹبال کھیلنے کے بعد ہم نہر میں نہار ہے تھے۔ اس روز فصیح الدین بھی آگئے۔ چونکہ کالج میں یہ ہمارے ساتھ شریک نہیں ہوے تھے اس لیے انھوں نے تیرنا بھی نہیں سیکھا تھا۔ سپورٹس میں یہ ہم سے ہمیشہ پیش پیش تھے اس لیے سمجھے کہ تیرنے میں بھی میں ان سے بازی لے جاونگا۔ کپڑے اتار لنگی باندھ یہ ٹانگیں لٹکا کر کنارے پر بیٹھ گئے اور سوچنے لگے۔ ہمارے کچھ ساتھی کدائی کر رہے تھے۔ اعجاز حسین کو جو شرارت سوجھی تو اس نے پیچھے سے آکر پانی میں ان کو دھکّا دے دیا۔ نہر چڑھی ہوئی تھی اور یہ پانی میں ڈبک ڈبک کرنے لگے اور چہرہ سفید ہو کر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ پھر یاروں نے ان کو نکالا اور نصیحت کی کہ تیرنا ایک دم سے نہیں آتا۔ پہلے کنارے

گر یا کسی اور چیز کو پکڑ کر پیروں کو مارو اور بدن کو سہارنا سیکھو۔ پھر چھوٹی جگہ ہاتھوں کو حرکت دے کر پانی کو چیرنا سیکھو۔ رفتہ رفتہ تمھیں تیرنا آجائیگا۔ چنانچہ سات آٹھ دن میں انھوں نے بھی تیرنا سیکھ لیا۔

فرحت کھاتے تو بہت کم تھے لیکن ہوکا بہت تھا۔ ایک دفعہ ان کی نانی امّاں نے ایک بڑا پیالہ (شاہ کاسہ) دہی کا بورانی بنا کر بھیجا۔ نانی کے بہت چاہیتے تھے۔ پیالے پر قبضہ کر لیا اور کہا میری نانی امّاں نے بھیجا ہے کسی اور کو کھانے نہ دونگا۔ اس وقت ان کی عمر پانچ چھ برس کی ہوگی۔ پھپی (حسن جہاں بیگم) بہتیرا منع کرتی رہیں لیکن انھوں نے ایک نہ سنی اور پیالہ دونوں ہاتھوں سے اٹھا منہ کو لگا لیا اور ساری بورانی پی گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بدہضمی ہوئی، دست آئے آخر دو وقت کا فاقہ ملا جب کہیں طبیعت صاف ہوئی۔ کالج میں بھی گرمی کے موسم میں فٹ بال کھیلنے کے بعد جب شدت کی پیاس ہوتی تھی۔ تو یہ اور ان کے ساتھی ایک بڑے مٹکے میں شربت کی پوری بوتل انڈیل لیتے تھے اور چار پانچ سیر برف کا ڈلا ڈال دیتے تھے۔ اتنے بڑے مٹکے کے لیے شربت کی ایک بوتل کافی نہ ہوتی تھی لیکن یہ پھیکے میٹھے کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے اور یہ اور ان کے چار پانچ یار دوست سارا مٹکا خالی کر دیتے تھے۔ جاڑے میں چاء کی بھی یہی شدت رہتی تھی اور آپس میں مقابلے ہوتے تھے کہ کون زیادہ پیالیاں پیتا ہے۔ چاء بجائے کیتلی کے ایک بڑے پتیلے میں دم دی جاتی تھی۔ سات پیالیوں تک تو میں بھی پہنچا۔ بارہ پیالیاں سرب کشن کا ریکارڈ رہا اور فرحت اٹھارہ پیالیاں پی کر سب پر بازی لے گئے۔ کھانے کی دعوتیں بھی اکثر ہوتی رہتی تھیں۔ سرب کشن نے رومانوی پیٹوؤں کے قصے پڑھے تھے۔ They ate to vomit and vomited to eat ۔ جب باداموں کا قورما اور گرم گرم شیرمال دسترخوان پر ہوتے تھے۔ یہ ظالم ڈٹ کر کھاتا تھا اور پھر کوٹھے پر جا حلق میں انگلیاں ڈال سارا نکال دیتا تھا اور کلّی کر کے پھر دسترخوان پر آن جیٹھتا تھا اور کھانے میں سب کے ساتھ شریک ہو جاتا تھا۔ فرحت نے سربی (سرب کشن) جیسا کمال تو پیدا نہیں کیا تھا لیکن یاروں پر رعب جمانے کے لیے یہ بھی اپنے پیٹ کے اندازے سے بہت زیادہ کھا لیتے تھے اور بعد میں پڑ جاتے تھے۔

دلی کی آبادی اس وقت ڈیڑھ پونے دو لاکھ ہوگی۔ مدرسوں اور کالجوں کی تعداد بھی کم تھی اور شریف گھرانے بھی گنتی کے تھے۔ ہماری ٹولی کی ذہانت کی وجہ سے یا کھیل کود میں مشاقی کی وجہ سے یا خاندانی شرافت اور عزت کے لحاظ سے ایسی شہرت تھی کہ ہر ایک امنگ بھرا لڑکا ہمارے ساتھ شریک ہونا چاہتا تھا۔ لیکن اپنی شرارتوں اور بے تکلفی کی وجہ سے ہم سوائے آٹھ دس ساتھیوں Comrades کے جو ابتدا سے چلے آرہے تھے اور کسی کو اپنی مجلس میں شریک نہیں کرتے تھے۔ روپے کی کمی کی وجہ سے ہم کو آخر میں چھنا مل والوں کے چند لڑکوں کو اپنی ٹولی میں شریک کرنا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ میں دلّی ملازمت کی وجہ سے چھوڑ چکا تھا۔ فرحت اور فصیح الدین حیدرآباد جانے کے منصوبے باندھ رہے تھے ٹولی کا رنگ بدل رہا تھا۔ آخر میں یونین کلب کی بنیاد پڑی جو اب تک دلّی میں ملکہ کے باغ Queen's Gardens میں موجود ہے۔ اس کلب کو چلانے میں ہماری ٹولی کے ہر دلعزیز رفیق دھنی چند نے قابلِ تعریف خدمات انجام دیں اور مدّت تک اس کے سکریٹری رہے۔ میرا نام بھی بحیثیت رکن اب تک کلب کے رجسٹر میں درج ہے اور فرحت بھی جب کبھی دلّی جاتے تھے شام کو کلب کا پھیرا ناغا نہ ہوتا تھا اور پرانے دوستوں کی صحبت میں اپنے لڑکپن اور جوانی کے قصوں کی یاد تازہ کرلیا کرتے تھے۔

۱۹۰۶ء میں فرحت دلّی سے حیدرآباد آئے یہاں ان کے عزیز و اقارب خصوصاً سرور الملک بہادر کا خاندان اعلیٰ عہدوں پر فایز تھا۔ مولوی عزیز میرزا مرحوم اس وقت ہوم سکریٹری تھے۔ فرحت ان سے ملے۔ مولوی صاحب جوہر شناس تھے خود بھی ایک زمانے میں ایسی ہی امیدوں کے ساتھ حیدرآباد آئے تھے۔ فرحت کو محکمہ تعلیمات میں ایک جگہ دیدی اور سمجھ گئے کہ یہ ہونہار نوجوان اپنی لیاقت کے بل بوتے پر ترقی کریگا۔ فرحت نے اپنی ملازمت کے حالات ایک کتاب کی صورت میں خود قلم بند کیے ہیں۔ یہ کتاب ابھی شایع نہیں ہوئی ہے اور ان کے کسی دوست کے پاس ہے۔ تلاش کی جارہی ہے اور اگر مل گئی تو اس کے بعض حصوں کے اقتباسات اس کتاب میں درج کیے جائینگے۔ جن عہدوں پر وہ فایز رہے اس کا ذکر ان مضامین میں آگیا ہے جو ان کی زندگی کے حالات کے متعلق فرحت کے

عزیزوں نے لکھے ہیں جو اس کتاب میں شامل ہیں اس لیے میں اس ذکر کو دہرانا نہیں چاہتا۔

حیدر آباد میں ان کے قدر دان اور آشنا تو بہت پیدا ہو گئے لیکن بے تکلف دوست چند ہی رہے۔ جن میں نواب سعید جنگ بہادر (ابو سعید مرزا) اور حامد علی صاحب خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ حامد علی صاحب نواب محمد نواز جنگ بہادر کے صاحبزادے ہیں اور مدت تک سشن جج رہ کر اب وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے ہیں۔ نواب سعید جنگ بہادر کی فرحت سے رشتہ داری بھی تھی۔ فرحت کی والدہ نواب سعید جنگ کی والدہ کی ماموں زاد بہن تھیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں کا نام مشرف جہاں تھا۔ سعید جنگ اور حامد علی صاحب کا فرحت سے بہت ہنسی مذاق رہتا تھا۔ حامد علی کی طبیعت میں ہمیشہ سے چہل ہے۔ یہ فرحت کی سادگی اور بھول پن سے فائدہ اٹھا کر ان کو چھیڑا کرتے تھے۔ وہ خوب سمجھتا تھا اور اپنی وضع اور عادات کو نہیں بدلتا تھا۔ کبھی فرحت کی کھڑ کھڑ یا موٹر کا ذکر ہوتا تھا۔ وہ کیا ماننے والے تھا۔ خود ایک طنزیہ مضمون اپنی موٹر کی شان میں لکھ ڈالا جو ان کے سلسلہ مضامین میں شایع ہو گیا ہے۔ کبھی فرحت کے مکان کے فرنیچر کا خاکا اڑایا جاتا تھا۔ فرحت نے دوستوں کو خوش کرنے کے لیے ایک Rio موٹر بھی خریدی اور ایک ملاقاتی کمرا بھی نئی وضع کے فرنیچر اور ساز و سامان سے سجایا۔ لیکن وہ کمرا ہمیشہ بند رہا اور فرحت یا باہر کے برآمدے میں اپنے احباب کے ساتھ مختلف وضعوں کی کرسیوں پر بیٹھے، جو کسی نیلام گھر (ہراج خانے) سے خریدی گئی تھیں یا گھر کے اندر کے پیش دالان میں لوٹ مار جس پر دری اور چاندنی کا فرش ہوتا تھا اور تکیوں کی بھرمار ہوتی تھی، کیونکہ فرحت مختلف وضع کے تکیے استعمال کرتے تھے۔ جب بیٹھتے تھے تو گاؤ تکیے کا سہارا لیتے تھے اور جب دراز ہوتے تھے تو سرہانے، پہلو اور ٹانگوں میں چھوٹے موٹے نرم تکیے کام آتے تھے۔

فرحت کی سادگی کسی خسّت کی وجہ سے نہ تھی، وہ بہت عالی حوصلہ اور فیاض تھے لیکن اپنی وضع بدلنی یا فضول باتوں پر روپیہ خرچ کرنا نہیں چاہتے تھے اور روپیہ آتا تھا سے وہ سب کنبے پر خرچ ہو جاتا تھا۔ چونکہ اولاد ماشاء اللہ زیادہ تھی اس لیے آخر عمر میں ان کی شادیوں کے لیے روپیہ کی ان کو بڑی فکر ہو گئی۔ دلی کے مکان اور گانو کی آمدنی

ان ہی کی نگہداشت پر خرچ ہو جاتی تھی۔ خدا کی تائید ہوئی کہ دوسری جنگ کے زمانے میں وہ مکان اور گانو اچھی قیمت پر بک گئے اور فرحت کو آخری عمر میں روپے پیسے کی طرف سے بڑا اطمینان ہو گیا۔

فرحت میں غپ اڑانے کا شوق خاندانی تھا اور بچپن سے تھا۔ غپ کے لیے تخیل اور ذہانت دونوں کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بغیر ان صفات کے غپ پھیکی پڑ جاتی ہے۔ یہ صفات ان کو آیندہ مضمون نویسی میں بہت کام آئیں۔ 'بورینو کا سفرنامہ' اور 'ولایت کا سفر' یہ سب فرحت کے تخیل کے کارنامے ہیں۔ ان کو غپ اڑانے میں لطف آتا تھا اور طبیعت بے چین ہو جاتی تھی۔ اب ایک قصہ سنیے مارچ ۱۹۰۵ء میں ہم دونوں بی۔اے کا امتحان دینے لاہور گئے۔ انہی دنوں میں لاہور میں غلام اور کیکر سنگھ کی کشتی ہوئی۔ ہم چونکہ امتحان میں لگے ہوئے تھے اور ٹکٹ بھی دس روپیہ سے کم نہ تھا اس لیے ہم کشتی دیکھنے نہیں گئے۔ نہ فرحت نے کشتی دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ البتہ اخباروں میں کشتی کا ذکر پڑھ لیا۔ اور محرم علی چشتی کے چند ملنے والوں سے کشتی کی پوری کیفیت بھی سن لی۔ ہم دونوں امتحان کے زمانے میں محرم علی چشتی کے ہاں ٹھیرے ہوے تھے ان کی ہمارے بزرگوں سے راہ و رسم تھی۔ جب انگریزی کا زبانی امتحان ختم ہوا اور چلنے کی تاریخ مقرر ہوئی تو مجھ سے کہنے لگے کہ دیکھو دلّی جا کر میں کلب میں اور دوسرے دوستوں سے کہونگا کہ میں کشتی دیکھنے گیا تھا اور چشم دید واقعات کی صورت میں کشتی کے واقعات بیان کرونگا۔ تم خاموش رہنا اور بیچ میں کچھ نہ بولنا۔ میں نے کہا مرد خدا آخر اس جھوٹ سے کیا فائدہ۔ کہنے لگے ارے میاں یہ جھوٹ نہیں ہے۔ ایسی باتوں سے اپنا بھی رعب جم جاتا ہے اور لوگوں کو بھی ایک دلچسپ قصہ سن کر لطف آجاتا ہے۔ چنانچہ جب یہ دلّی پہنچے تو انھوں نے عزیزوں سے اور کلب میں کشتی کا ذکر کیا اور ایسی تفصیل بیان کی اور کشتی کے فنی پینتروں اور داؤ پیچ کو ایسے انداز سے سنایا کہ سب فرحت کی گفتگو سے بے حد خوش ہوئے۔

جب فرحت نے مولوی نذیر احمد صاحب کا مضمون لکھا تو ان کے بعض عزیز میرے پاس شکایت کرنے کے لیے آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ فرحت میں مبالغے کی عادت ضرو

ہے لیکن جو باتیں اس نے بڑھا چڑھا کر بیان کی ہیں ان کی تہ میں اصلیت ضرور ہے۔ میں نے ان لوگوں سے یہ بھی کہا کہ ہندوستانی ابھی تک حق بات سننے کے عادی نہیں ہیں۔ ولایت میں دیکھیے کہ وزیر اعظم تک کی تصویریں اور اقوال اور عادات کیسی مضحکہ خیز صورت میں پیش کی جاتی ہیں اور کوئی اس کا برا نہیں مانتا بلکہ فن کار کی جدّت اور ذہانت کی تعریف کرتے ہیں۔ جب شاہ ایڈورڈ اپنی رومان میں مبتلا تھے اور بالڈون اور آرچ بشپ اوف کنٹربری اس جنون کو ان کے سر سے اتارنا چاہتے تھے تو برنارڈ شا نے ایک مضمون اس واقعہ کی نسبت لکھا۔ جس میں شاہ کی کمزوری پر تو نہایت لطیف انداز میں طنز ہے لیکن بالڈون اور آرچ بشپ اوف کنٹربری کا بری طرح مضحکہ اڑایا ہے۔ وہ مضمون لاکھوں کی تعداد میں بکا اور بڑے شوق سے پڑھا گیا اور نہ بالڈون نے اس کا برا مانا اور نہ آرچ بشپ اوف کنٹربری نے۔ فرحت کا آرٹ بھی لطیف ہجوگو Caricaturist کا آرٹ تھا۔ جو بغض اور دشمنی سے بالکل پاک تھا البتہ کمزوریوں کو وہ ایک دلکش اور پسندیدہ انداز میں بیان کرنے سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔

بعض لوگوں نے فرحت کی مزاح کا پطرس کے مزاح سے مقابلہ کیا ہے۔ بعض نے رشید احمد اور چغتائی کے مزاح سے۔ پطرس کی تحریر میں ذہنیت البتہ بلند ہے لیکن زبان کی شادابی اور سلاست اور فن کاری میں وہ پطرس سے بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ رشید احمد کے مزاح میں آورد اور تصنّع ہے اور چغتائی کی ظرافت تو محض بکواس ہے۔ فرحت کی تحریر کی خصوصیات کے متعلق اس کتاب میں کئی مضمون ہیں جو اردو ادب کے مسلّم نقّادوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں مولوی عنایت اللہ مرحوم، مولوی وحید الدین سلیم مرحوم اور مولوی عبدالحق صاحب کی رائیں بھی پڑھنے والوں کو فرحت کی نثر نگاری کا صحیح اندازہ کرنے میں ضرور مدد دینگی۔ اس لیے میں ان کو بھی درج کیے دیتا ہوں۔

مولوی عنایت اللہ صاحب لکھتے ہیں[1]:-

پینتیس یا چھتیس برس ہوئے کہ شمس العلما مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم ایجوکیشنل

---

[1] یہ رائے مولوی عنایت اللہ صاحب نے سنہ ۳۰ عیسوی میں قلم بند فرمائی تھی۔

کانفرنس میں علی گڑھ تشریف لائے۔ میں اس زمانے میں نیا نیا بی۔ اے ہوا تھا۔ شام کو میں
اور دو تین اور نوعمر بی۔ اے مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر تھے۔ مولوی صاحب میرے
والد سے باتیں کرتے کرتے یکایک مجھ سے مخاطب ہوئے اور کہنے لگے "میاں عنایت اللہ!
میں دیکھتا ہوں کہ جتنے تم بی۔ اے ہو بالکل مردا ہو۔ روتی صورتیں، بسورتی شکلیں، تم
لوگوں کی تقریر اور تحریر دونوں ڈل، پھیکی اور بدمزا۔ یہ جملے مولوی صاحب نے کچھ ایسی
آواز میں کہے کہ میں سمجھا اب خیر نہیں ہے، کوئی دم جاتا ہے کہ مولوی صاحب ہم میں سے
دو ایک کو پرزے پرزے کرکے ردّی میں پھینک دینگے۔ مگر اس کے بعد کچھ مسکرائے اور
پھر ایسی باتیں کرنے لگے کہ ہم دیر تک ہنستے اور خوش ہوتے رہے۔ مولوی صاحب کا
یہ انگریزی لفظ 'ڈل' برسوں میرے کانوں میں گونجا کیا۔

حال میں میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی۔ اے کے یہ مضامین پڑھے تو مولوی صاحب
کا وہ جملہ پھر یاد آیا اور اب معلوم ہوا کہ تحریر کا 'ڈل' نہ ہونا کس کو کہتے ہیں۔ حقیقت میں
استاد کی تعلیم نے اپنے شاگرد سے یہ عیب تو ضرور نکال دیا۔ یا یہ کہیے کہ شاگرد شروع ہی سے
ایسا ملا جو استاد سے کم نہ تھا۔ میرزا صاحب کے ان مضامین کو پڑھیے، کسی ایک فقرے کی
نسبت بھی یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ پھیکا، بے لطف یا 'ڈل' ہے۔ موضوع کا انتخاب، عبارت
میں روانی، زبان پر قدرت، بیان میں زور بلا کا رکھتے ہیں۔ مضمون پڑھتے جائیے اور جی
نہ بھرے۔ حیران رہیے کہ اس طغیانی کو دیکھ کر کہا جائے تو کیا کہا جائے۔ حقیقت یہ ہے
کہ زبان ہو تو ایسی ہو اور بے ساختہ پن ہو تو ایسا ہو۔ دلّی بدنام ہے اور بہت بدنام ہے
اور ایک حد تک یہ درست بھی ہے۔ شمس العلما مولوی خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم نے
ایک موقع پر دلّی کے نوجوانوں کو غیرت دلانے کے لیے فرمایا تھا۔

حالی کو تو بدنام کیا اس کے وطن نے
اور آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو

سنانے والے دلّی والوں کو یہ شعر مزے لے لے کر سناتے رہے، جواب ہی کیا تھا۔ مگر اب
میرزا صاحب نے جو دلّی کے باشندے کیا، دلّی کی پرانی اینٹ ہیں، وطن کا نام رکھ لیا

اور یہی کہنا پڑا کہ دلی پھر دلی ہے کچھ اور نباشد۔

دنیا کے حالات اور انسان کے تعلقات یا قدرت کے منظر اور انسان کی صنعتیں ان کی اصلی کیفیت و حالت میں اثر کے ساتھ لکھنی ہر زبان میں مشکل ہیں، لیکن ہماری زبان میں تو ان کا نقش اتارنا ایک مصیبت ہو جاتا ہے۔ دوسری زبانوں سے مقابلہ کیجئے تو اردو کی کم مایگی دل فگار ہے۔ الفاظ کی قلت نے جو خود کردہ ہے کسی قابل نہ رکھا۔ شعرا نے شعر کی خاطر لفظوں کو کم کرتے کرتے جو کچھ چھوڑا ہے وہ اشک بلبل سے زیادہ نہیں شعر کے تو مالک تھے ہی، نثر پر بھی سکہ جمایا۔ طرح طرح کی مصنوعی قیدیں لگا کر ناطقہ بند کر دیا کہیں صحت الفاظ پر گرفت ہے، کہیں ذم کے پہلو پر ناک بھوں چڑھتی ہے، کہیں سوقیت اور رکاکت کا الزام عاید ہوتا ہے۔ کوئی ضرب المثل یا کہاوت لکھیے، یا پھبتی اڑائیے تو وہ دانت کے نیچے کا کنکر ہو جاتی ہے۔ مقامی خصوصیات کی پاسداری میں دلوں میں کدورت رہنے لگتی ہے۔ غرض بولنا، لکھنا، پڑھنا، سننا سب دشوار کر دیا۔ آزادی کا ہر طرح سے گلا گھونٹا۔ خیالات کی سوتیں خشک کر دیں۔ لیک سے ذرا ہٹے نہیں کہ اغراض کے درندے غاروں سے نکل کر پھاڑ کھانے کو دوڑے۔ الفاظ کی کمی، قیدوں کی زیادتی، مذاق کی تنگی اور خست نے یہاں تک نوبت پہنچائی کہ دنیا دامن پھیلائے سامنے ہے، ہم دیکھتے ہیں مگر بیان نہیں کر سکتے۔ جب بیان نہ کر سکے تو دیکھنا بھی چھوڑ دیا۔ گونگے تھے، اندھے بھی ہو گئے جب نظر نہیں رہی تو دوسرے کے بیان کا لطف بھی غارت ہوا۔ اصل کو دیکھا نہیں، نقل کی کیا قدر کرتے۔ حقیقت کا نقش جب دل پر غلط اتر چکا ہو تو پھر مقابلہ کس سے اور تعریف کس کی۔

انسانی تعلقات کی کثرت لاتعناہی ہے۔ فطرت کے جلووں میں کوئی قید نہیں خوش نما اور بدنما چیزیں ایک ہی بساط پر ہیں اور یہ بساط اپنی مجموعی شان میں حسین ہے انھیں کو دیکھو، لکھو، پڑھو اور سنو۔ مگر یہاں حقیقت سے بحث نہیں رہی ہر چیز میں ایک مصنوعی قطع و برید ہے۔ لقمۂ شیریں کے سوا کوئی چیز حلق سے اترتی ہی نہیں۔ ہمت کر کے قدرت کے نقش لینے بیٹھے بھی تو مجبور ہیں۔ سوائے چند مستند الفاظ کے کسی لفظ کے برتنے کا

حکم نہیں۔ ڈرے ہچکچائے حلقے سے باہر نکلنے کی جرأت بھی کی تو پانوں من من بھر کے ہوگئے تھوڑی دیر میں حقیقت اور اصلیت کو خیرباد کہہ تصنع کے میدان میں اتر آئے۔ پھر وہی بزم ادب کی رونق کے لیے نظم ہو یا نثر گل فرغانہ' ہے اور لالۂ کابل۔ صبا کی رفتار ہے اور نسیم کے جھونکے۔ موج اور حلقۂ موج، ساحل و گرداب ہے اور ہم ہیں۔ اصلی نقشے اور حالت سے کوسوں دور بہہ نکلے۔ حقیقت پرست پکارتا ہی رہا کہ صرف پھول ہی نہیں بہت سے خار بھی چننے پڑینگے، پھل کا گودا ہی نہیں اس کا چھلکا اور گودا بھی نگلنا ہوگا۔ یہ آپ کی جوارش مروارید کب تک کام دیگی۔ بیمار ہو آٹے میں بھوسی ملا کر کھاؤ اور کھلاؤ تاکہ تندرستی قایم رہے۔ طبیعت ہوشیار ہو، تاریکی اور کسل دور۔ سینے میں ایک دھوپ سی کھلی رہے۔ دل خوش، حواس تیز، زندگی اور زندہ دلی ہر وقت ہاتھ میں ہاتھ دیے رہیں۔ بدنما اور خوش نما کچھ نہیں ہے، دونوں کا مرکب اصلی حسن ہے۔ سچی بات کہو، سچا نقشہ اتارو اور صحیح اثر پیدا کرو۔

اسی قسم کی بجا حسرتیں اور بے جا شکایتیں ہیں جو نثر میں اردو اور انگریزی کے تفریحی لٹریچر کا مقابلہ کرکے دل میں پیدا ہوتی ہیں اور جب ان سے طبیعت متأثر ہو تو میرزا صاحب کے مضامین پڑھ کر ایک تسکین سی ہوتی ہے۔ فن بھی یہی کہتا ہے اور اہلِ فن بھی یہی کہتے آئے ہیں کہ حقیقت کی نقل میں حقیقت سے نہ ہٹو۔ زمین و آسمان میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب اچھا ہے اور آخر میں بھلائی کے لیے ہے۔ اس کا ہر ایک پہلو دیکھنے نقشہ اتارنے اور لکھنے کے قابل، مفید اور سبق آموز ہے۔ مثال کے لیے میرزا صاحب موجود ہیں مگر ہم کیوں کر مانیں۔ کچھ مجبوری ہے، بہت کچھ سہل انگاری، تصنع اور تقلید کی عادت۔ زمانہ ایک ایک کی گردن میں ہاتھ ڈال کر کہتا ہے، چلو آگے بڑھو۔ مگر ہم ہیں کہ دو قدم چلے اور رہ گئے۔ جس گھر کو چھوڑنا پڑا ہے اس کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ گھر کیسا اب تو کسی ٹوٹی دیوار کا سایہ بھی نصیب نہ ہوگا۔ ہمیشہ کے اسیر آزاد ہوئے بھی تو کیا! اسی پرانے قفس کی تیلیوں پر اب بھی پروں میں سر چھپائے بسیرا لیے رہتے ہیں۔ اسیری و قید تتبع و تقلید کسی رنگ میں ہو طبیعت کا خاصّہ بن گیا ہے۔ نفع نقصان سوچنے کی خو نہیں

رہی۔ میرزا صاحب بہت سی قیدوں اور تکلفات سے آزاد نظر آتے ہیں، گو ان کو اس کی خبر نہ ہو۔ خبر ہوتی بھی تو کیا کر لیتے۔ بہر گلگشت تو نکلے ہی نہ تھے کہ دو چار قدم کے خرام ناز میں مقطع تک پہنچ جاتے۔ ان کو تو نثر کی زمین میں گرم و سرد دونوں ملکوں کے میدانوں سے اونٹ کی نکیل تھامے دور کی منزل طے کرنی تھی۔ آورد کہاں سے لاتے آمد ہی آمد ہے اور جس قدر ہے بہت خوب ہے۔ دلکش واردات کی ایک داستان پیش کر دیتے ہیں، جو دم روک کر پڑھنی پڑتی ہے۔ ان کی بے تکلفی پر کسی تکلف کا گمان نہیں ہو سکتا۔ شاید وہ لکھ کر پھر پڑھتے بھی نہ ہوں۔ ہر چیز اور کیفیت کو پوری توجہ سے دیکھنے اور ہر بات کو دل سے سننے کا قدرتی ملکہ رکھتے ہیں۔ ہر نقش دل میں صحیح اترتا ہے اور یاد رہتا ہے خیال کی تحریک پر زبان آپ سے آپ حاضر ہو جاتی ہے اور میرزا تصور کے بادوباراں میں مضامین کے دریا بہا دیتے ہیں۔ بہتے دریا کی تنقید کون کرے۔ حیرت میں منہ سے چند بے ربط باتیں نکل رہی ہیں۔ ان کی تحریر عکسی تصویر ہوتی ہے، جس میں حسن و قبح، عیب و ہنر کچھ نہیں چھوٹتا۔ رنگ بھرتے ہیں مگر ہلکے اور قدرتی۔ سایہ اور روشنی کی جگہ برمحل الفاظ اور برجستہ جملے ہوتے ہیں۔ مصوری میں استاد فضل دہلوی کے شاگرد ہوں ہوا کریں مگر یہاں تو وہ موی قلم سے حسن باطل کے مصور نہیں۔ فطرت کے مرید ہیں، فطرت خواہ عام اشیا کی ہو، خواہ انسان کے قلب کی۔ سورج کی کرن سے مدد لے کر نقاشی کرتے ہیں اور سب کچھ اتار لیتے ہیں۔ پڑھنے والے کے دل پر اثر ہوتا ہے۔ طبیعت خوش ہوتی ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سا عیب نکال کر میرزا کی تعریف کیجیے۔ عیب ہے تو یہی ہے کہ دلّی کے ہیں اور اردو کے رسالے میں لکھتے ہیں۔ جدول پر قلعہ معلّیٰ کا نقشہ ہے اور زبان میں اردو معلّیٰ کا سحر۔ ناظرین خود ان مضامین کو پڑھ کر میرزا صاحب کے کمال کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ کسی تقریب کی ضرورت نہیں۔

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

مولوی وحید الدین سلیم نے یہ تحریر فرمایا ہے:۔

میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی۔ اے دہلوی جو اس مجموعہ مضامین کے

مصنف ہیں نہایت ذہین اور طبّاع ہیں۔ اگرچہ مدّت سے وہ حیدرآباد میں مقیم ہیں، تاہم ان کی زبان میں بلکہ لب و لہجے میں اب تک کوئی فرق نہیں ہوا۔ یہ تمام مضامین ادب لطیف سے تعلق رکھتے ہیں، گو وہ ادب لطیف نہیں جو آج کل ہندوستان کے بعض رسالوں میں جاری ہے اور جس کے طرزِ بیان میں "کوکائیت" بھری ہوئی ہے اور جس سے نوجوانوں کے جذبات نفسانی مشتعل ہوتے ہیں۔ اس مجموعے میں وہ ادب لطیف ہے جس پر ہماری زبان جس قدر ناز کرے بجا ہے۔ میرزا صاحب کو مکانوں اور مکینوں کے حلیے بیان کرنے اور واقعات کا نقشہ کھینچنے میں کمال ہے۔ جس جگہ کا اور جس زمانے کا وہ حال بیان کرتے ہیں، اس کا سماں آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ جن اشخاص کی وہ تصویر کھینچتے ہیں، ان کو ہم زندہ تصوّر کرتے ہیں۔ ان کے خط و خال، ان کا لباس، ان کی نشست و برخاست، ان کی گفتگو اور ان کے حالات و خیالات سب پڑھنے والوں پر آئینہ ہو جاتے ہیں۔ دلّی کے خاص تعلیم یافتہ لوگوں کے سوا یہ روانی، یہ سادگی، یہ تصویر کشی، یہ شوخی و لطافت کسی اور شہر کے رہنے والے کو نصیب نہیں ہو سکتی۔ مجھے نہایت مسرّت ہے کہ یہ نادر لطیف مضامین اب طبع ہو گئے ہیں، ان سے ہندوستان کے ہر انشا پرداز کو ایک نیا سبق حاصل ہوگا۔ وہ اگر مضامین کو غور سے پڑھینگے تو ان کو معلوم ہوگا کہ ہمارے گرد و پیش جو واقعات رات دن گزرتے ہیں، ان کو کس طرح دلکش انداز میں بیان کرنا چاہئے اور جن اشخاص سے ہم کو کبھی سابقہ ہوا ہے، ان کی سیرت کی زندہ تصویر کیونکر کھینچنی چاہئے۔

مولانا عبدالحق صاحب یوں لکھتے ہیں:-

ادائے مطلب کے بہت سے ڈھنگ ہوتے ہیں اور جیسا جس کا مزاج ہوتا ہے اسی ڈھب کا اس کا اسلوب بیان ہوتا ہے۔ میرزا فرحت اللہ بیگ کا طرزِ تحریر بھی ان کی طبیعت سے ملتا جلتا ہے۔ بیان سادا ہے، تصنع نام کو نہیں۔ ٹھیٹھ دلّی کی زبان لکھتے ہیں۔ تحریر میں شوخی بھی ہے اور ظرافت کی چاشنی بھی۔ میرزا صاحب کو فن مصوّری میں بھی دخل ہے، اس لیے ان کی نظر چیزوں کے مختلف پہلوؤں پر، کھلے ہوں یا ڈھکے، وہیں پڑتی ہے جہاں نکتے کی کوئی بات ہوتی ہے اور جس پر سے عام نظریں سرسری طور سے

گزرجاتی ہیں۔ ان کی اس نظر کی بدولت مضمون میں جان پڑجاتی ہے اور ان کا قلم خط وخال درست کرکے ایک اور ہی رنگینی پیدا کردیتا ہے۔

ایک مدت تک میرزا صاحب فرضی نام سے لکھتے رہے۔ مگر چھپائے سے ایسی باتیں چھپ تھوڑی سکتی ہیں۔ آخر یہ راز 'ظم نشرح' ہوگیا اور میرزا صاحب کو کشاں کشاں میدان میں آنا پڑا۔ مضامین کے اس مجموعے میں وہ دو مضمون بھی ہیں جو اس سال اردو کے رسالے میں شایع ہوے ہیں۔ مولانا نذیر احمد کا جو نقشہ انھوں نے کھینچا ہے اسے پڑھیے' وہ حرف بحرف میرے رائے کی تائید کرتا ہے۔ خدا کرے' میرزا صاحب اس طرف متوجہ رہیں اور ان کے یار دوست ان کی طبیعت اکھڑنے نہ دیں' ورنہ ان کے لاابالی پن سے ڈر ہی معلوم ہوتا ہے۔

ان جگت استادوں کی رایوں سے اور اس ادبی تنقید سے جو اس کتاب میں صاحب ذوق لکھنے والوں نے کی ہے فرحت کی فن کاری Art کے مختلف پہلو واضح ہوجاتے ہیں۔ ان کے ابتدائی تین بڑے مضمونوں کو ہی لیجیے' یعنی مولوی نذیر احمد صاحب کی کہانی' دلّی کا آخری مشاعرہ اور پھول والوں کی سیر' ہر ایک آرٹ کا ایک بے مثل شاہ کار ہے۔ مولوی نذیر احمد والے مضمون میں فرحت نے عقیدت اور طنز Satire کو سمو کر اردو ادب میں کردار نویسی کے ایک نئے ڈھنگ کی بنیاد ڈالی ہے۔ دلّی کے آخری مشاعرے میں ان کا ادبی ذوق' ان کی عکاسی' ان کے الفاظ کی موزونیت اور ترتیب کی خوبی اور پھر اعلیٰ تخیل اور قدرت بیان ایسی صفات ہیں جو ان کے نام کو اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ پھول والوں کی سیر میں بھی وہی ساحرانہ فن کاری موجود ہے لیکن اس مضمون میں دلّی کے آخری تاجدار اور دلّی والوں کے شوق اور امنگ کی ایک موثر داستان بیان کرکے انھوں نے بحیثیت ادیب اپنی شہرت میں اور چار چاند لگالیے۔ فرحت کے انتقال کو ابھی تین ہی برس ہوے ہیں اس لیے بعض مبصر یہ کہیں کہ ان کے آرٹ کا اندازہ آیندہ نسلیں بہتر کرسکینگی' لیکن جو عالم گیر مقبولیت فرحت کو خود اپنی زندگی میں حاصل ہوگئی ہے وہ اس بات کی ضامن نظر آتی ہے کہ مستقبل میں بھی ان کا نام درخشاں رہیگا۔

اس کتاب میں جو مضمون درج ہیں چونکہ مختلف اصحاب کے لکھے ہوے ہیں اور مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں اور سب 'یادگار فرحت' میں شامل ہونے کے لیے لکھے بھی نہیں گئے۔ اس لیے تکرار جا بجا نظر آیئگی اور موضوع کے لحاظ سے تسلسل بھی مفقود ہے۔ تاہم ہر ایک مضمون سے فرحت کی زندگی یا ادبی قابلیت کے کسی نہ کسی پہلو پر نظر پڑتی ہے اور چونکہ مضمون کے بعض حصّے حذف کر دینے سے اس کی مجموعی شان میں فرق آجاتا تھا اس لیے میں نے مضمونوں کے سر قلم کرنے یا ہاتھ پیر کاٹنے کی جراٴت نہیں کی، بلکہ ہر ایک کو جوں کا توں رکھا ہے۔ بعض مضامین ریڈیو کے لیے لکھے گئے تھے اور پڑھے جا چکے ہیں، بعض رسالوں میں شایع ہو چکے ہیں، بعض اردو مجلس کے ایما سے مرتب ہوے ہیں اور وہ سب آپ کے سامنے پیش ہیں۔ سلونے بھی ہیں، میٹھے بھی اور پھیکے بھی۔ جو محتاط اور پرہیزی طبیعت کے ہیں وہ پھیکے ہی چٹ کریں، باقی جس کو سلونے کا ذوق ہے اس خوانِ نعمت سے سلونوں کا لطف اٹھائے اور شیرینی کے شوقین میٹھی چیزوں کا مزا لیں۔

اس کتاب کی اشاعت میں میرزا عصمت اللہ بیگ نے میری بے حد مدد فرمائی ہے اور ان کا ایک شگفتہ مضمون بھی اس کتاب میں شامل ہے۔ لیکن تعریف کے سب سے زیادہ مستحق سجاد میرزا صاحب ہیں جنھوں نے چندے کی فراہمی اور اس فنڈ کی اغراض کو پورا کرنے میں فرحت مرحوم سے اپنی والہانہ محبت کا عملی ثبوت پیش کیا ہے اور یہ انھی کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ 'یادگار فرحت' بھی شایع ہو گئی ہے اور فرحت میموریل پرائز کا بھی، جو ایک دوامی انعام ہے، انتظام ہو چکا ہے۔

باغ نارنج۔ حیدر آباد دکن

۱۲ اکتوبر ۱۹۵۰ء

غلام یزدانی

فرحت میموریل فنڈ

چندا دینے والوں کے نام

حروف تہجی کی ترتیب میں

(۱) جناب احمد جنگ بہادر (احمد اللہ)

(۲) جناب نواب امین جنگ بہادر مرحوم (احمد حسین)

(۳) جناب احمد حسین خاں صاحب

(۴) جناب راجہ آر مودو آئنگار بہادر

(۵) جناب احمد محی الدین صاحب

(۶) جناب احمد محی الدین انصاری صاحب

(۷) جناب احمد خاں صاحب

(۸) جناب نواب اکبر یار جنگ بہادر (غلام اکبر خاں)

(۹) جناب امیر چند کھنّا صاحب

(۱۰) جناب بشیر احمد صاحب

(۱۱) جناب پران کشن صاحب

(۱۲) جناب راجہ پنگل راما ریڈی بہادر

(۱۳) ڈاکٹر جعفر حسن صاحب

(۱۴) جناب حامد علی خاں صاحب

(۱۵) جناب ڈاکٹر حامد نواز جنگ بہادر (حامد علی)

(۱۶) جناب مولوی حبیب الرحمان صاحب

(۱۷) جناب نواب داؤد جنگ بہادر (داؤد علی خاں)

(۱۸) جناب میرزا رفعت اللہ بیگ صاحب

(۱۹) جناب ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب

(۲۰) جناب نواب زاہد جنگ بہادر (زاہد حسین)

(۲۱) جناب نواب زین یار جنگ بہادر (زین الدین)

(۲۲) جناب سجاد میرزا صاحب

(۲۳) جناب نواب سعید جنگ بہادر (ابو سعید میرزا)

(۲۴) جناب شاہد سہروردی صاحب

(۲۵) جناب میرزا شرافت اللہ بیگ صاحب

(۲۶) جناب عبد القادر سروری صاحب

(۲۷) جناب نواب عسکر یار جنگ بہادر (سید عسکری حسن)

(۲۸) جناب آنریبل غلام محمد صاحب

(۲۹) جناب ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب
(۳۰) جناب مولوی فرحت اللہ صاحب
(۳۱) جناب فضل الرحمان صاحب
(۳۲) جناب مولوی قمر الزماں صاحب
(۳۳) جناب مولوی کرم اللہ صاحب
(۳۴) جناب قاری کلیم اللہ صاحب
(۳۵) جناب نواب کیقباد جنگ بہادر
(۳۶) جناب مولوی لطیف احمد فاروقی صاحب
(۳۷) جناب مولوی محمد احمد میرزا صاحب
(۳۸) جناب مولوی حامد علی عباسی صاحب
(۳۹) جناب مولوی محمد مرتضیٰ خاں صاحب
(۴۰) جناب نواب محمود یار جنگ بہادر (غلام محمود قریشی)
(۴۱) جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صاحب
(۴۲) جناب نواب معین نواز جنگ بہادر (معین الدین انصاری)
(۴۳) جناب میرزا مقصود احمد خاں صاحب
(۴۴) جناب نواب مقصود جنگ بہادر (حکیم مقصود علی خاں)
(۴۵) اسٹیٹ مہاراجہ آنجہانی (سر کشن پرشاد)
(۴۶) جناب نواب مہدی نواز جنگ بہادر (سید محمد مہدی)
(۴۷) جناب کرنل نذیر الاسلام صاحب
(۴۸) جناب پروفیسر ہارون خاں شروانی صاحب
(۴۹) جناب ڈاکٹر ہاشم امیر علی صاحب
(۵۰) جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب

حالاتِ زندگی

دوستوں اور عزیزوں کی زبانی

میرزا فرحت اللہ بیگ

یہ مضمون ایک مقدس فریضے کا ادا کرنا ہے، میرزا صاحب کو مرحوم کہتے ہوئے ذرا تامل ہوتا ہے کیونکہ ساٹھ برس تک جب ساتھ رہا ہو تو بقیہ تھوڑی سی زندگی میں ان کو جدا سمجھنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ نہیں ان کا ہنس مکھ چہرہ میری آنکھوں کے سامنے ہے، ان کی رسیلی پاٹ دار آواز اور دلکش نغمے میرے کانوں میں گونج رہے ہیں، ان کی محبت کا ابلتا ہوا چشمہ میرے دل کو سیراب کر رہا ہے، ان کی ذہنی براقی میرے دماغ پر ضو فگن ہے، اللہ کے نیک بندے مرتے نہیں، وہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں، بل احیاءٌ ولکن لا تشعرون۔

فرحت اللہ بیگ ترک نژاد تھے، ان کا خاندان شاہ عالم کے زمانے میں ہندوستان آیا، یہ وہی خاندان ہے جس کے متعلق میرزا غالب فرماتے ہیں۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آباء سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

اس شاعرانہ بے اعتنائی کے باوجود اس خاندان میں شعر و سخن کی طرف خاص میلان رہا ہے اور بہت سے صاحب کمال گزرے ہیں۔ خود غالب کے زمانے میں نیر اور علائی اور بعد میں تاباں اور سائل۔ سائل کا انتقال تو گزشتہ سال ہی ہوا ہے، فرحت اللہ بیگ کے دو حقیقی چچا بھی شاعر تھے، ایک شاکر تخلص فرماتے تھے اور دوسرے ذاکر، دونوں صاحب دیوان تھے، خاندانی رشتے کا تعلق خواجہ میر درد اور مومن سے بھی تھا اور نثر نویسوں میں خواجہ میر امان مترجم بوستانِ خیال بہت قریب کے دادا تھے، ایسے خاندان کے ایک فرد کے لیے ذہین اور

طباع ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔

میرزا فرحت اللہ بیگ ۱۸۸۳ء کے آخر یا ۱۸۸۴ء کے شروع میں پیدا ہوئے اور اس حساب سے ان کی عمر ۶۳ یا ۶۴ سال کی ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اسلامی طریقے پر ہوئی۔ پہلے قرآن شریف پڑھا، پھر دینیات اور فارسی قواعد اور ادب کی چند ابتدائی کتابیں۔ ان کی عمر نو سال کے قریب ہوگی کہ میرے بڑے بھائی صاحب نے ننھے منھے ذہین فرحت کو شاہ جی کے چھتے کے مدرسے میں لے جا کر تیسری جماعت میں شریک کرا دیا۔ یہ تحتانیہ جماعتوں میں بھی اپنی غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے ہمیشہ ممتاز رہے اور آخری امتحان میں ایسے اعلیٰ نشانات حاصل کیے کہ وسطانیہ تعلیم کے لیے ان کو سرکاری وظیفہ مل گیا۔ شاعری کا ملکہ اور قابلیت بہت کم عمر ہی میں پیدا ہوگئی تھی۔ ہمارے ایک اُستاد مولوی محمد سعید نامی تھے، قابل آدمی تھے اور شاعر بھی برے نہ تھے۔ کیونکہ جب کبھی کوئی وائسرائے یا گورنر دہلی آتا تھا تو میونسپلٹی کے ارکان تہنیت اور خوش آمدید کا قصیدہ مولوی محمد سعید سے ہی لکھواتے تھے۔ چنانچہ ایسا ہی کوئی موقع تھا، مولوی صاحب قصیدے کی تیاری میں منہمک تھے، جماعت میں بھی گنگناتے رہتے تھے۔ میرزا صاحب نے خبر نہیں کس طرح سے اس قصیدے کی ردیف اور قافیہ اور بحر معلوم کر لی اور دس شعر اسی وزن میں کہہ ڈالے۔ مجھے سنائے، شعر اچھے تھے، میں نے کہا مولوی صاحب کو بھی سنا دو، کہنے لگے، کہیں ڈُنبا جل کر قمچی سے سونت نہ ڈالے مولوی صاحب کا پچھلا حصہ بہت بھاری تھا، اس لیے طالب علموں نے ان کا نام ڈُنبا رکھ دیا تھا۔ کونسا اُستاد طالب علموں کی پھبتیوں سے بچ سکتا ہے۔ میں نے کہا میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔ مولوی صاحب ایسے ظالم نہیں، وہ خطا پر بے شک مارتے ہیں۔ چنانچہ ہم دونو گئے اور دو شعر سنائے، مولوی صاحب کچھ ہکّا بکّا سے ہو گئے اور جتنی داد فرحت کی ذہانت کی ان کو دینی چاہیے تھی، وہ سٹ پٹاہٹ کی وجہ سے نہ دے سکے۔

فرحت اللہ بیگ مدرسے کی فوقانیہ جماعتوں میں بھی ہمیشہ اول و دوم رہے اور جب انٹرنس کا امتحان پاس کیا تو وہ نقرئی تمغہ جو دہلی کے کشمیری دروازے کے سرکاری مدرسے کے اول آنے والے طالب علم کو ملتا ہے ان کو عطا کیا گیا۔ مدرسے کے کھیلوں میں

بھی شریک رہے، لیکن ان میں ایسی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی جیسی ان کے پھپی زاد بھائی فصیح الدین نے حاصل کی۔ ہاں فرحت اللہ بیگ کے کردار کی ایک خصوصیت جو اوائل عمر میں بھی ان میں موجود تھی، بیان کرنا ضروری ہے، وہ ان کی صاف گوئی تھی۔ یہ بعض اوقات بے محل بھی ہوتی تھی۔ کرک پیٹرک نامی ایک انگریز ہیڈ ماسٹر تھا، انتظامی معاملات میں بھی بہت سخت تھا، بعض شریر لڑکوں کے متعلق اس نے میرزا صاحب سے دریافت کیا اور انھوں نے ایسا بے موقع جواب دیا کہ اس نے ان خاطی طالب علموں کے زمرے میں جن کو سزا دی جانے والی تھی، ان کو بھی شامل کرلیا۔ مجھے خبر ہوئی، میں کرک پیٹرک کے پاس گیا، وہ خود بھی ان کو چاہتا تھا، فوراً معاف کردیا۔

کالج میں پہنچ کر میرزا صاحب اپنی غیر معمولی ذہانت اور برّاقی طبع سے اور چمکے۔ بی۔ اے کی جماعت میں انھوں نے ہارکورٹ پرائز حاصل کیا، انعام کا مضمون اس سال غدر کے حالات پر تھا جو انھوں نے گھر کی بڑی بوڑھیوں سے پوچھ کر لکھے اور نہایت سلیقے سے ان کو ترتیب دیا۔ کالج کے استادوں میں پادری ڈبے اور پادری اینڈریوز ان پر بہت مہربان ہوگئے یہ دونوں پادری بڑے پایے کے آدمی تھے، اینڈریوز نے تو جو کام ہندوستان کے مزدور پیشہ اور غریب لوگوں کی ہمدردی اور اصلاح کے لیے کیا ہے، وہ اس ملک کی قومی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ پادری ڈبے بعد میں آئرلینڈ کے اسقف اعظم ہوگئے۔ اس رتبۂ جلیلہ سے ان کی فضیلت اور اعلیٰ اخلاق کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ پادری اینڈریوز شیکسپیئر پڑھاتے تھے اس سال ہنری دی ففتھ Henry the Fifth اور مرچنٹ اوف وینس Merchant of Venice نصاب میں شامل تھے۔ فرحت اللہ بیگ ہنری دی ففتھ کی یہ تقریر Once more into the breach ایسے مؤثر انداز میں جماعت میں سناتے تھے کہ لڑکوں پر تو کیا پادری اینڈریوز کو بھی تعجب ہوتا تھا کہ ایک ہندوستانی لڑکا انگریزی جذبات کو کس خوبی سے ادا کررہا ہے۔ مرچنٹ آف وینس میں شائیلوک کا پارٹ بھی نہایت عمدہ طور سے کرتے تھے۔ چنانچہ کالج کے سالانہ جلسے میں جب یہ ڈراما کھیلا گیا، تو دلی کے انگریز حکام اور شہر کے پڑھے لکھے صاحب ذوق لوگوں نے فرحت کی اداکاری کی دل کھول کر داد دی۔ اس ہمت افزائی کا

ایسا اثر ہوا کہ میرزا صاحب نے کالج کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ایک امیٹیور ڈرامٹک کلب Amateur Dramatic Club. بھی بنائی، جس نے دہلی اور الور میں شیریڈن کا مشہور ڈراما Duenna نہایت کامیابی کے ساتھ ادا کیا۔ کالج میں میرزا صاحب کی ہر دلعزیزی کا باعث ان کی گپ بازی اور سریلی آواز بھی تھی۔ جاٹوں تک کو بھی جو اس زمانے میں سینٹ سٹیفنز کالج میں اچھی تعداد میں پڑھتے تھے انہی کے دیہاتی گیتوں سے محو کر دیتے تھے، مجھے دو گیتوں کے بول یاد رہ گئے ہیں۔ پہلا

کلکتے سے چلا فریجن پانچوں پیر منائے

فریجن، فریزر، کی خرابی ہے۔ یہ دہلی کے رزیڈنٹ مقرر ہوئے۔ ایک جاٹنی سے عشق کیا۔ اس سے شادی کر لی۔ گیت دیہاتی زبان میں اسی واقعہ کے متعلق کہا ہے۔

دوسرا گیت یہ ہے

چلے مارو پٹنے کے دیس

اس میں ایک جاٹنی اپنے خاوند کے باہر جانے پر، اپنے جذبات کا اظہار کرتی ہے۔

فرحت اللہ بیگ کا یہ کمال تھا کہ ایسے اُتار چڑھاؤ سے پڑھتے تھے اور ایسے لہجے سے گاتے تھے، کہ معلوم ہوتا تھا کہ سچ مچ کوئی دیہاتن گا رہی ہے۔

کالج کی چار دیواری سے باہر کھیل کے میدان میں میرزا صاحب کی مقبولیت کا وہی عالم تھا، ایک سال تک کالج کی ٹیم کے کپتان رہے۔ گیند اچھی طرح پھینکتے تھے، جس میں لیگ بریک Leg break تھا۔ بریک کے علاوہ گیند تیز ہوتی تھی اور بیچ اکثر یورکر Yorker pitch اس لیے اچھے کھلاڑی بھی ان کی گیند پر جلد خارج ہو جاتے تھے۔

کرکٹ کا یہ شوق حیدرآباد آن کر بھی رہا، چنانچہ ان کی شادی جب میرزا ساجد بیگ صاحب کی بڑی صاحبزادی سے گلبرگہ میں ہوئی تو دوسرے دن براتیوں کی تفریح کے لیے کرکٹ میچ کا انتظام کیا گیا اور اس روز فرحت اللہ بیگ نے گیند پھینکنے کا اور فصیح الدین صاحب نے کھیلنے کا کمال دکھا کر حاضرین کو محظوظ کیا۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جب ملازمت کا سوال پیدا ہوا، تو یہ خبر کسی طرح

نواب سر امیر الدین خان رئیس لوہارو کو پہنچی، جو ننھیالی تعلّق سے فرحت اللہ بیگ کے قریبی رشتے دار تھے۔ نواب صاحب نے کہا، میں بیلی صاحب رزیڈنٹ حیدر آباد کو خط لکھدوں گا وہ فرحت کو کوئی اچھی خدمت دلا دیں گے۔ میرزا صاحب کی پُھپّی جنھوں نے ان کو نہایت محبّت سے پالا تھا۔ یہ نہیں چاہتی تھیں کہ فرحت دلّی سے باہر جائے، جملہ معترضہ کے طور پر یہ بھی میں بیان کردوں، کہ میرزا صاحب کی والدہ کا ان کی شیر خواری کے زمانے میں انتقال ہو گیا تھا، لیکن پُھپّی کو ان سے والہانہ محبت تھی، اور چونکہ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی، اور وہ بیوہ بھی تھیں، اس لیے فرحت ہی ان کی آنکھوں کا نور اور دل کی ٹھنڈک تھے، میرزا صاحب کے بعض عزیز مثلاً نواب سردار الملک بہادر کا خاندان چالیس برس پہلے حیدر آباد پہنچ چکا تھا، اور یہاں رس بس کر پکّا حیدر آبادی بن گیا تھا۔ جوانی کے زمانے میں کیا کیا امنگیں نہیں ہوتیں، فرحت اللہ بیگ نے پُھپّی کو سمجھایا اور اپنے حیدر آباد جانے کے لیے ان کو رضامند کر لیا۔ یہاں ۱۹۰۷ء؁ کے آخر میں وہ پہنچ گئے، بیلی صاحب کے نام جو چٹّھی لائے تھے اس سے تو کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ البتہ مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم نے جو اس وقت ہوم سیکریٹری کے عہدے پر فایز تھے ان کو لائق اور نیک کردار دیکھ کر ہیڈ ماسٹری کی خدمت دے دی، تنخواہ قلیل تھی لیکن فرحت اللہ بیگ کو کبھی ہوس نہیں ہوئی۔ ان کو کام کا عشق تھا، اس خدمت کو بڑی لیاقت اور گرم جوشی سے انجام دیا ہو گا۔ کیونکہ نواب محمود یار جنگ بہادر آج تک فرحت سے اپنی شاگردی کے تعلق کو فخریہ بیان کرتے ہیں۔ محکمہ تعلیمات میں یہ تھوڑے ہی دن رہے، بعد میں ہائی کورٹ کے مترجم مقرر ہوئے اور رفتہ رفتہ اپنی قابلیت اور محنت کے زور پر بغیر کسی سفارش کے ایک عہدے سے دوسرے عہدے پر ترقّی کرتے رہے۔ مترجمی کے بعد صیغہ دار مرافعہ ہوئے، اور پھر صیغہ دار انتظامی اور بعد ازآں نائب معتمد۔ یہ پہلی گزیٹڈ خدمت تھی جو ان کو ملی۔ ترقی کے ساتھ ان کی قابلیت کی شہرت بڑھتی گئی۔ فوجداری خدمات کے جلد تصفیے کے لیے اسپیشل مجسٹریٹی کا ایک نیا عہدہ قایم ہوا تھا۔ یہ عہدے دار دورہ کر کے مختلف اضلاع کے اہم مقدمات کے متعلّق ضروری کارروائی کرتا تھا۔ میرزا صاحب کا تقرر جب اس خدمت پر ہوا تو انھوں نے اپنے مفوضہ فرایض کو نہایت دیانت، محنت اور عجلت سے انجام دیا۔

اور سرکار کے منشاء کو باحسن وجوہ پورا کیا۔ اسی خدمت کے زمانے میں میرزا صاحب کو مضمون نویسی کا شوق پیدا ہوا جس کا ذکر میں بعد میں کروں گا۔

بعد ازآں یہ عدالت العالیہ کی معتمدی اور جوڈیشل سیکریٹریٹ کی مددگاری پر فایز رہے۔ نواب اکبر یار جنگ بہادر اس وقت جوڈیشل سیکریٹری تھے۔ انھوں نے فرحت اللہ بیگ کے کام کی بے حد قدر کی، اور دونوں میں سرکاری تعلق سے قطع نظر ایسا الفت اور محبت کا رشتہ قایم ہوگیا جو اب بھی ویسا ہی استوار باقی ہے، اسی اثناء میں ان کے بے لاگ کام، جرأت اور لیاقت کا حال ارکان باب حکومت کو معلوم ہوا اور یہ دو اہم کمیشنوں کے یکے بعد دیگرے معتمد مقرر ہوئے۔ ان کمیشنوں میں سے ایک رایلی کمیشن پایگاہوں سے متعلق تھی، اور دوسری سرہربوٹ کمنگ کمیشن ناندیڑ کی مسجد کے جھگڑے کے تصفیے کے لیے مقرر کی گئی تھی، رایلی اور کمنگ پر میرزا صاحب کی قابلیت کا ایسا سکہ بیٹھا کہ دونوں نے سرکار میں ان کی قانونی واقفیت، معاملہ فہمی اور عام لیاقت کی نہایت بلیغ الفاظ میں تعریف کی۔ میرزا صاحب کچھ عرصے کے بعد سشن جج ہو گئے اور گلبرگہ میں ان کی تعیناتی ہوئی۔ گلبرگہ میں یہ کئی سال رہے، اور یہیں ان کی شاعری کو فروغ ہوا۔ مہاراجہ بہادر آنجہانی کی وزارت کا زمانہ تھا، یہ ان کے کلام کی دل کھول کر داد دیتے تھے، اور ہمیشہ ارشاد ہوتا تھا کہ جب حیدرآباد آؤ کوئی نئی چیز کہہ کر لاؤ۔ اس قدر افزائی سے میرزا صاحب نثر نویس سے پورے شاعر بن گئے، اور گلبرگہ میں فرصت کے اوقات شعر و سخن کے مشغلے میں گزرنے لگے۔

گلبرگہ کے قیام میں میرزا صاحب پر مذہبی رنگ چڑھا۔ نماز کے سختی سے پابند ہوگئے، اور آخری دم تک یہ پابندی باقی رہی۔ ربیع الاول کے مہینے میں ہر سال ایک نئی نعت لکھتے تھے، جو قلعے کی مسجد کی محفل میں پڑھی جاتی تھی۔ گھر پر بھی بارھویں تاریخ کی شب کو بیدار رہتے تھے اور صبح چار بجے نہایت پُردرد لہجے میں دعائیہ نظم پڑھتے تھے، جس میں ان کے بچے بھی شریک ہوتے تھے۔

فرحت اللہ بیگ زندگی کے تفریحی مشاغل سے بھی غافل نہ تھے، گلبرگہ کی کلب کو انھوں نے بے حد رونق دی۔ وہاں کا زنانہ کلب بھی ان کی اور ان کی نیک خاتون کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ کلب کی زندگی میں انھوں نے سرکاری عہدہ داروں کی بے جا اکڑ کو ختم کر دیا، اور اپنے

علم اور بردباری اور شرافت اور تواضع سے چھوٹے بڑے سب کے دل کو یکساں موہ لیا۔

گلبرگہ سے حیدرآباد میرزا فرحت اللہ بیگ انسپکٹنگ افیسر کی خدمت پر آئے، یہ عہدہ ہائی کورٹ کے جج کے مماثل ہے اور وہی دو ہزار ماہوار تنخواہ ہے۔ وظیفۂ حسن خدمت پر علیحدہ ہونے تک وہ اس عہدے پر فایز رہے۔ وظیفے کے بعد سرکار نے کچھ عرصہ تک حیدرآباد کے نئے دستور کے متعلق ان سے کام لیا۔ بعد میں یہ اپنے علمی مشاغل میں منہمک ہو گئے، جو آخری وقت تک اسی شوق و ذوق سے جاری رہے۔ چنانچہ جس مہینے میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا اس میں چار نئے مضمون لکھے اور ایک تازہ نظم مرتب کی جو اردو مجلس کے اجلاس میں اپنی آخری نیند سے صرف تیس گھنٹے پہلے حاضرین کو سنائی۔

میرزا فرحت اللہ بیگ کی مضمون نویسی مزاحیہ رنگ میں شروع ہوئی لیکن بعد میں ادب کا کوئی ایسا موضوع نہیں رہا جس پر انھوں نے رشحہ افشانی نہ کی ہو۔ سوانح حیات، قصہ، افسانہ، ادبی تنقید، سماجی اصلاح، سیاسی نظریے، سفر و سیاحت، فکاہات، الغرض انسانی زندگی کے ہر پہلو کو انھوں نے اپنے خاص رنگ میں پیش کیا ہے۔ مولٰنا عبدالحق صاحب نے خاص فرمایش سے مولٰنا نذیر احمد کی کہانی، ان سے لکھوائی۔ بعد میں دہلی کا آخری مشاعرہ، بھی میرزا صاحب نے مولوی صاحب کے ہی کہنے سے اورنگ آباد کالج ڈے کے لیے لکھا۔ یہ دونوں مضمون اب یادگار ہو گئے ہیں اور جامعات کے نصاب میں شامل ہیں۔ دہلی کے پھول والوں کی سیر بھی بڑے مضمونوں میں بے مثل ہے اور اس کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی ہے، انجمن ترقیٔ اردو کے سلسلۂ مطبوعات کے لیے میرزا صاحب نے دیوانِ یقین اور دیوانِ نظیر اکبر آبادی کی بھی نہایت محنت سے تصحیح کی اور عالمانہ تنقیدی مقدمے لکھے، سماج کی اصلاح کے لیے جو مضامین لکھے گئے ان کی تعداد بھی بہت بڑی ہے، اور ایسے پُرلطف انداز میں لکھے گئے ہیں کہ نصیحت کی تلخی بالکل معلوم نہیں ہوتی، اور پڑھنے والا ہنس ہنس کر اپنی کمزوریوں پر نادم ہو جاتا ہے۔ مثلاً مہینے کی پہلی تاریخ، کے مضمون کو پڑھ کر کون سی حیدرآباد کی بیوی ہے جو نہ ہنسے گی، لیکن اس میں ان کی خانہ داری کی بے عنوانیاں آئینہ کر دی گئی ہیں۔

میرزا صاحب، کی زبان کی شستگی اور بیان کی روانی کا کیا کہنا، مولوی عنایت اللہ مرحوم

کہتے تھے کہ فرحت اللہ کی روانی ایک تیز بہتا دریا ہے جس کے زور کے سامنے کسی کی تنقید کیا ٹھیر سکتی ہے۔ الفاظ اور محاورے کے وہ بادشاہ تھے، جو لکھتے وہ چل جاتا تھا۔ بعض الفاظ جو معمولی روزمرّہ میں استعمال ہوتے ہیں، اور تحریر میں نہیں آتے، ان کو ایسا بے کھٹکے لکھ جاتے تھے کہ دوسرا متعجب ہوتا تھا، لیکن اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ مزاح کا رنگ ان کی تحریر میں غالب تھا، اور اسی وجہ سے ان کو یہ عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی۔ میرزا صاحب کے پیش نظر سامعین اور قارئین میں ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگ تھے، یہ سب کے لیے نقل محفل تھے، اور شستہ اور مہذب مذاق کے دلدادوں کو چیں بہ جبیں نہ ہونا چاہیے کہ میرزا صاحب ایسی گفتگو پر کیوں اُتر آتے تھے جو پھکڑوں اور بازاریوں کو ہی خوش کر سکتی ہے۔

علاوہ مستقل کتابوں کے مضامین کے سات حصے شایع ہو چکے ہیں اور دو تین کا مسالا موجود ہے۔ نظم کی ابتداء گو بعد میں ہوئی، لیکن پھر بھی غزلوں، قطعوں، رباعیوں اور نظموں کو ملا کر کلّیات کی ایک ضخیم جلد شایع ہو سکتی ہے۔ نظموں میں نظیر اکبر آبادی کا اور غزلیات میں میر تقی میر کا رنگ غالب ہے۔ میرزا صاحب نے اساتذہ کا کلام خوب پڑھا تھا، خود اپنی طبیعت میں بھی جدّت تھی، اور پھر زبان پر پورا عبور۔ اس لیے جو کہا ہے، خوب کہا ہے۔ ان کی بڑی نظموں میں "جمنا کا کنارا" بہت مقبول ہوا۔ پڑھتے بھی اس خوبی سے تھے کہ محفل پر چھا جاتے تھے۔ اپنی ہمہ رنگی کے بارے میں خود فرماتے ہیں: "میر کے رنگ میں لکھتا ہوں، اس سے غرض نہیں کہ کامیابی ہوئی یا نہیں، شعر کہا یا منہ چڑایا" اس صاف گوئی کا کیا کہنا، اب میر کے رنگ میں ان کے چند اشعار سُن لیجیے، فرماتے ہیں

اپنے بیمارِ غم کو دیکھ تو آ — کہتے ہیں ہوشیار ہے اب تک
ہے خزاں اور دل کے زخموں سے — میرے گھر میں بہار ہے اب تک
موت آ چکی، کہ غیر کے غم میں — دیکھ وہ سوگوار ہے اب تک
اس کے وعدے کو ہو گئے برسوں — اور مجھے انتظار ہے اب تک

کیا زمانہ بھی تھا جوانی کا
جس کا فرحت خمار ہے اب تک

میرزا صاحب کی ادبی قابلیت اور ذہنی صفات کے علاوہ ان میں بہت سی انسانی خوبیاں تھیں، سب میں زیادہ ایک محبت بھرا دل رکھتے تھے۔ ہر دوست یہی سمجھتا تھا کہ اس سے زیادہ وہ کسی اور سے اتنی الفت نہیں رکھتے۔ جب دوستوں کے ساتھ یہ حال ہو، تو بیوی بچوں کے ساتھ کیا شیفتگی نہ ہوگی، بیوی کا ذکر ہمیشہ نہایت محبت اور احترام سے کرتے تھے، اور حقیقت میں ان کے جذبے کا سچا اظہار تھا۔ گھر میں آنے کے بعد ہر وقت وہ سامنے رہتی تھیں۔ میرزا صاحب عدالتی فیصلے لکھ رہے ہیں، رسالوں کے لیے مضمون لکھ رہے ہیں۔ یا کوئی غزل یا نظم مرتب ہو رہی ہے، بیوی سامنے بیٹھی رہتی تھیں۔ پان وہ خود ہی بنا بنا کر دیتی رہتی تھیں، لیکن جب ذہنی کاوش زیادہ ہوتی تھی میرزا صاحب خود بھی مانگ لیتے تھے۔ بچے وہیں کھیلتے رہتے تھے، غل مچاتے تھے، لیکن یہ اپنے انہماک میں مطلق پروا نہ کرتے تھے، بعض اوقات جوشِ محبت میں گلے سے لگا لیتے تھے اور پیار کر لیتے تھے، اس طرح ان کی دماغی کوفت دور ہو جاتی تھی۔

طبیعت میں بے حد سادگی تھی، لیکن بڑے اولوالعزم تھے، جب تنخواہ کم تھی تب بھی بڑے کنبہ پرور تھے! اور جب تنخواہ زیادہ ہوئی، تب بھی پیسہ نہ بچا۔ اور سب متعلقین کے آرام و آسائش پر خرچ ہوا۔ اپنے مرض کے خطرے کو خوب جانتے تھے، لیکن نہایت بہادری سے مقابلہ کرتے رہے اور کبھی ہراساں نہیں ہوئے۔ موت کے لیے تیار تھے اور شاید کلام الٰہی کی یہ آیات ان کے دل پر اثر پذیر تھیں، اور قربت کی طرف کھینچ رہی تھیں۔

یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی

(سورۃ الفجر۔ آیات ۲۷۔۳۰)

غلام یزدانی

فرحت کی زندگی کے چند پہلو

میرزا فرحت اللہ بیگ کے نام سے ہندوستان کا تقریباً ہر چھوٹا بڑا واقف ہے، اور جن لوگوں نے اُن کے مضامین پڑھے ہیں وہ غالباً اُن کے شجرے سے بھی واقف ہوں گے۔ اس لیے کہ بعض مضمون ایسے بھی ہیں جن میں بڑی تفصیل سے وہ اپنے خاندانی حالات بیان کر گئے ہیں وہ ترک نژاد تھے۔ ڈیل ڈول اور صورت شکل بھی مغلوں کی سی تھی اور آنکھیں بھی مغلوں کی طرح چھوٹی چھوٹی چپیاں جیسی تھیں مگر عقاب کی طرح تیز اور نسر طائر کی طرح روشن۔ مغلوں کا قاعدہ تھا کہ فتح حاصل کرنے کے بعد وہ دشمنوں کے کاسۂ سر میں شراب پیتے تھے، اس رسم کو انھوں نے اپنے ایک شعر میں بڑی خوبی سے ادا کیا ہے ؎

میں کچھ نہ سہی فرحت اُس قوم کا ہوں لیکن
فغفوروں کے سر جس نے پیمانے بنا ڈالے

غالب، خواجہ میر درد اور مومن خاں سے قرابت تھی اور خواجہ بدرالدین خاں مترجم بوستانِ خیال اور سعادت یار خاں رنگین سے رشتے داری تھی۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

ہوا یہ ریختی نکلی ہے ان ہی کے گھرانے سے
سنا ہوگا میاں رنگیں سے جو رشتہ ہے فرحت کا

مرحوم ہمیشہ کہتے تھے کہ میں خالی کے مہینے میں پیدا ہوا تھا۔ مگر نہ تو کبھی اللہ نے ہمیں یہ توفیق دی کہ اُن کی پیدائش کا سنہ پوچھتے اور نہ کبھی انھوں نے بتایا۔ خدا مولوی غلام یزدانی صاحب کو خوش رکھے، انھیں سنہ اور تاریخیں بنانے میں کمال حاصل ہے، اور کیوں نہ ہو بچپن سے وہ اسی فن میں بڑے ہوئے ہیں، مرے مُردے قبروں سے اکھاڑتے ہیں اور

پُرانے سے پُرانے باوا آدم کے زمانے کے مقبروں اور گنبدوں کا سنہ تعمیر بتا دیتے ہیں، پھر بھلا مرحوم کا سنہ پیدائش بتا دینا ان کے لیے کیا مشکل تھا۔ بچپن کے ساتھی ہیں، میں نے پوچھا تو انھوں نے فوراً اپنی لال کتاب اٹھائی اور پوتھی لاکر بتایا کہ مرحوم ۱۸۸۴ء کے اوایل میں پیدا ہوئے تھے، لیجیے اس حساب سے اُن کی عمر کوئی ۶۴ سال کی ہوتی ہے۔

بھائی فرحت دہلی میں پیدا ہوئے تھے، وہیں تعلیم و تربیت پائی، وہیں ایم۔ اے تک پڑھا اور وہیں چھوٹے سے بڑے ہوئے، اس کے بعد حیدرآباد آگئے۔ یہاں آکر ملازم ہوئے، یہیں شادی ہوئی، یہیں پنشن ہوئی اور یہیں انتقال ہوا، اور یہیں الٰہی چمن کی خاموش فضا میں آرام سے سو رہے ہیں۔ انھیں حیدرآباد سے بہت محبت تھی، مگر شعر و شاعری اور لکھنے پڑھنے کے معاملے میں ہمیشہ بڑے فخر سے بولتے تھے، کہ میاں! میں خالص دہلی کی زبان لکھتا ہوں! جہاں کہیں موقع ملتا دلی کا ذکرِ خیر کر دیتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں ؎

غزل سُن کر مزا آجاتا ہے دلّی کی اردو کا
خدا اچھا رکھے واللہ کیا کہنا ہے فرحتؔ کا

مرحوم ہرفن مولا تھے۔ مصوری کا انھیں شوق تھا، اور مضمون نگاری اور شعر و شاعری، سے انھیں دلچسپی تھی۔ پھر کمال یہ ہے کہ جس فن میں ہاتھ ڈالا، اُسے اس خوبی سے کر دکھایا، کہ بڑے بڑے اُستاد بھی اُن کا لوہا مان گئے۔

مرحوم کو ڈراما نویسی اور اداکاری سے قدرتی لگاؤ تھا۔ قسمت سے انگلستان کا ایک مشہور اداکار ہیمنگ نامی پھرتا پھراتا دہلی آگیا تھا۔ یہ بھلا کہاں چوکنے والے تھے، فوراً پہنچے اور اُس کے شاگرد ہوگئے اور اس سے مدتوں اداکاری سیکھی۔ حافظہ بلا کا پایا تھا، جو چیز پڑھتے فوراً یاد ہو جاتی۔ اپنے پارٹ کے ساتھ دوسروں کے پارٹ بھی نوکِ زبان رہتے تھے۔ شیکسپیر کے کئی ڈرامے حفظ تھے، ہنری دی ففتھ میں، شاہ ہنری کا پارٹ اور مرچنٹ آف وینس میں شائلاک کا پارٹ، خوب کرتے تھے۔ ہاتھوں کی نپی تُلی حرکات، آنکھوں کے اشارے اور آواز کا اُتار چڑھاؤ، جذبات کے جزر و مد کو اُبھارتا رہتا تھا۔ آواز میں خاص قسم کی کشش تھی، جب کڑک کر بولتے، تو معلوم ہوتا کہ ترم بج رہا ہے۔

بھائی فرحت اپنی تعلیم ختم کر کے ۱۹۰۸ء میں دہلی سے سیدھے حیدر آباد آئے۔ یہاں ان کے بعض رشتے دار، جیسے نواب سرور الملک بہادر، نواب سربلند جنگ، مولوی عزیز میرزا صاحب مرزا خدا داد بیگ، مرزا ساجد بیگ اور مرزا واجد بیگ وغیرہ بڑی بڑی خدمتوں پر مامور تھے۔ مولوی عزیز مرزا ہوم سیکریٹری تھے۔ شاید یہ دیکھنے کے لیے کہ دیکھیں ہمارا یہ نوجوان رشتہ دار کتنے پانی میں ہے، فوراً ان کا تقرر گورنمنٹ ہائی اسکول چادر گھاٹ کی مددگاری پر کر دیا۔ مرحوم مدرسہ کی زندگی سے تو خوب واقف تھے، علمی قابلیت تھی، ہنس مکھ اور ظریفانہ طبیعت تھی، کھیل کود کشتی اور جمناسٹک میں طاق تھے اور کرکیٹ وغیرہ کھیلنے میں مشاق تھے۔ انھوں نے آتے ہی وہ دلچسپیوں کے سامان بہم پہنچائے، کہ چند روز ہی میں تمام طالب علموں کو اپنا گرویدہ کر لیا۔

مختصر یہ ہے کہ یہاں آ کر میرزا صاحب کو جوش آیا اور پہلی مرتبہ گورنمنٹ اسکول میں انھوں نے ڈراما کیا۔ وہ ڈراما کیا تھا، چوں چوں کا مربہ تھا، اس میں اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کے الفاظ شامل تھے، مگر اس کی تعریف یہ ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے اس ڈرامے میں حصہ لیا تھا اب تک اسی کا راگ الاپتے رہتے ہیں اور جو تماشائی اس وقت موجود تھے اور اس وقت بہ قید حیات ہیں اب تک اس کی یاد سے لطف اٹھاتے رہتے ہیں۔ میرزا فرحت اللہ بیگ مدرسہ میں زیادہ نہیں ٹکے۔ تھوڑے سے عرصے کے بعد ہی وہ مترجمی کی خدمت پر عدالت العالیہ میں منتقل ہو گئے، مگر وہ اپنے طالب علموں میں ایک ایسا جذبہ چھوڑ گئے تھے جو اب تک ان کے دلوں کو گرما رہا ہے۔ چنانچہ بعض طالب علم تو ایسے ثابت قدم ثابت ہوئے، کہ جب انھیں جوش آتا تو بغیر الٹی میٹم دیے ہوئے نازل ہو جاتے اور اپنا سبق دہرا کر چل دیتے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب کا نام تو ضرور بتاؤں گا' حسین علی میرزا، آج کل عثمانیہ یونیورسٹی میں قانون کے پروفیسر ہیں۔ یہ اسکول ڈرامیٹک کلب کی روح رواں اور فنا فی الڈراما تھے۔ اگر خدانخواستہ دو چار مہینے تک کہیں ڈراما نہ ہو تو ان کے پیٹ میں چوہے دوڑتے رہتے تھے۔ فوراً ایک نیا ڈراما لکھا جاتا، پارٹ تقسیم ہوتے، ری ہرسل ہوتا، بھائی فرحت کے سامنے دہرایا جاتا، جب وہ پاس کر دیتے تو مدرسہ میں اسٹیج کرتے تھے، یا یار دوستوں کو دعوت دے کر وہ خود اپنے گھر میں ڈراما کر ڈالتے تھے۔ ان کے علاوہ باقی اور بھی حالی موالی ہیں، جو اب بڈھے مرنے کو آئے مگر ڈرامے کے جراثیم اب بھی ان کے تن بدن میں مینڈک کی طرح

پھدکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ہاں تو میں بھائی فرحت کے متعلق کہہ رہا تھا کہ وہ انگریزی ڈراما خوب کرتے تھے، مگر یہ انگریزی ڈرامے مدرسہ اور کالج کی حد تک تھے۔ اصلی شوق تو انھیں اردو ڈراموں سے تھا۔ کہا کرتے تھے کہ یورپ میں جو ڈرامے کا معیار قایم ہو چکا ہے، اس تک پہنچنے میں ہمیں مدتیں چاہئیں۔ میاں! ہم تو بہ قول شخصے ڈرامے کی دُم بھی نہیں جانتے ـــــ مگر آغا حشر سے ان کا پُرانا یارانا تھا، اور ہمیشہ تعریف کیا کرتے تھے، کہتے تھے کہ اس کے مرنے سے اردو ادب کا ایک پہلو بالکل تاریک ہو گیا۔ ۱۳۵۴ف میں آغا حشر کا انتقال ہوا۔ مرحوم نے تاریخ کہی تھی وہ بھی سن لیجیے ؎

حشر کے مرگِ ناگہانی پر | دوستوں کی عجیب حالت ہے
کر دیا غم نے مجھ کو پژمردہ | یوں تو کہنے کو نام فرحت ہے
سوچتا تھا کہ اب کسی میں بھی | جانشینی کی قابلیت ہے

جب نہ نعم البدل رہا تو کہا
حشر کی موت اک قیامت ہے

وہ ڈراما دیکھتے اور خوب ٹھوک بجا کر دیکھتے، پھر فوراً اپنی رائے بھی ظاہر کر دیتے اور دوسرے روز اُس پر ایک چٹ پٹا سا نوٹ لکھ کر اخبار چونچ یا کسی دوسرے فلمی رسالے میں بھیج دیتے۔ وہ ڈرامے میں کیا دیکھتے تھے؟ میں بتاؤں، بس گنتی کی تین چار باتیں تھیں۔ وہ اگر ٹھیک ہیں تو ڈراما بھی ٹھیک ہے ورنہ پیسے ڈنڈا اور ڈراما بے کار۔ پہلے تو وہ یہ دیکھتے تھے کہ ہر ایک کردار برابر اپنے مقررہ رستے پر چل رہا ہے یا نہیں، جہاں وہ رستے سے بھٹکا اور اُنھوں نے وہیں ٹوکا، کہ "لاحول ولا، ارے میاں یہ بات اس کے منہ سے کہلانے کی نہیں تھی، میرے یار نے کیا اناپ شناپ ڈراما لکھ مارا ہے"! پھر تاریخی پس منظر اور ماحول کو دیکھتے تھے۔ پھر یہ کہتے تھے کہ ڈرامے میں جو قصے ہیں اُن کی کڑیاں آپس میں ایک دوسرے سے اچھی طرح ملی ہوئی ہیں یا نہیں۔ جہاں اُس میں کوئی کمزوری دیکھی اور ٹہوکے دینے شروع کر دیے کہ ارے میاں! یہ تو دو ڈرامے ہو گئے۔ دوسرے صاحب کو یے وہ کیا سمجھیں کہ فقیر کیا ڈالتا ہے اور کیا نکالتا ہے، فوراً کہہ دیتے کہ نہیں بھائی یہ تو وہی ڈراما ہے دوسرا کہاں سے آجائے گا، یہ کہتے کہ میاں! تم نے خیال نہیں کیا، ظالم نے اصل ڈرامے سے

اس قصّے کا ربط ہی نہیں رکھا ہے۔ تیسرے یہ چیز دیکھتے تھے کہ ڈراما دریا کی طرح بہتا چلا جائے اور ساتھ ہی ساتھ سین سینریاں آسانی سے بدلتی چلی جائیں۔ جہاں ڈرامے میں اس قسم کی کوئی رکاوٹ یا کمزوری دیکھتے، تو کہتے تھے کہ چلو بھائی ذرا باہر چکر لگا آئیں، اب یہ ظالم اپنا سین بدلنے کے لیے پندرہ بیس منٹ تک کھٹ پٹ کرتا رہے گا۔

اردو ڈراموں کی اصلاح اور ترقی کے لیے حیدر آباد میں بھی کئی انجمنیں کھولی گئیں۔ اُن میں ہماری انجمن، انجمن ترقی ڈراما بھی تھی۔ مولوی فضل الرحمٰن صاحب اس کے بانی مبانی تھے۔ ایک دفعہ مولوی فضل الرحمٰن صاحب کا لکھا ہوا ڈراما "ظاہر باطن" دکھایا جا رہا تھا "حاضرین والا تمکین" کا وہ زور کہ معاذ اللہ، تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ بہ قول شخصے تھالی پھینکتے تو سروں پر جاتی اور رائی چھوڑ سکتے تو زمین پر نہ آتی۔ بھائی فرحت بھی اگلی صف میں ڈٹے ہوئے تماشا دیکھ رہے تھے اور اُن کے دونوں لڑکے میرزا رفعت اللہ بیگ اور میرزا شرافت اللہ بیگ بڑے زوروں سے پارٹ کر رہے تھے۔ ڈراما نہایت لاجواب تھا۔ رفعت اللہ بیگ اور شرافت اللہ بیگ دونوں کے دونوں اداکاری کا حق ادا کر رہے تھے اور میرزا صاحب دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے اور پھولے نہیں سماتے تھے کبھی پلاٹ کی تعریف کرتے تھے تو کبھی زبان کی، کبھی کرداروں کی تعریف کرتے تھے تو کبھی میک اپ کی۔ اب سنیئے، دوسرے ڈراپ کا پہلا سین ڈیپ تھا اور اتفاق دیکھیے کہ دوسرا سین بھی ڈیپ آپڑا۔ بھلا میرزا صاحب یہ کہاں دیکھ سکتے تھے، فوراً ایک صاحب کو ٹہوکا دے کر بولے کہ لیجیے یہاں آکر آپ کا ڈراما بھی قلابازی کھا گیا۔ دوسرا تو کوئی بھی اس قلابازی کو نہ سمجھا، مگر یہ آخر تک برابر قلابازی کھاتا رہا۔ ڈراما ختم ہونے کے بعد گھر پہنچے، راتوں رات ایک اسٹریٹ سین لکھا اور دوسرے روز انجمن کے معتمد صاحب کو بھیج دیا۔ واقعی میرزا صاحب نے دکھتی رگ پکڑی تھی اور یہ کمزوری ضرور تھی۔ چند روز کے بعد پھر وہی ڈراما دکھایا گیا جس میں اُن کا لکھا ہوا سین شریک تھا میرزا صاحب دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ایک صاحب نے کہا کہ واہ اُستاد کمال کیا، کیا ڈانڈے سے ڈانڈا ملایا ہے۔ بولے، دیکھ لیجیے، جائے اُستاد خالی است۔

بھائی فرحت نے بھی کئی ڈرامے لکھے۔ ایک خاموش فلم کے لیے مزاحیہ ڈراما لکھا تھا، اس میں بالکل چارلی چیپلن کا مذاق اڑایا تھا۔ اگر وہ ہندوستان میں ہوتا، تو بس مزا آجاتا۔

دوسرا بولتی فلم کے لیے لکھا تھا۔ علاءالدین، اسے بھی اہلِ قلم نے بہت پسند کیا۔ اس ڈرامے کو فلمانے کے لیے ایک صاحب بمبئی سے بات چیت کرنے کے لیے آئے اور اُس میں کچھ ردوبدل کرنے کی اجازت چاہی۔ کہنے لگے کہ مجھے اتنی فرصت کہاں کہ اس میں ردوبدل کرتا بیٹھوں۔ کہنے لگے کہ آپ کوئی فکر نہ کیجیے، وہ ہم اپنے مکالمہ نویسوں سے درست کرالیں گے۔ بولے کہ جناب! یہ درست کرانے کے کیا معنی؛ میں آپ سے صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ اگر کسی نے اس کا ایک حرف بھی ادھر سے اُدھر کیا، تو پھر میں اُس کی جان کو آجاؤں گا اور گلا گھوٹ دوں گا۔ اس نے کہا کہ یہ کام بغیر آپ کے مشورے کے نہیں ہوگا۔ کہنے لگے کہ آپ میرے حال پر رحم فرمائیے، میں ایسے فلمانے سے باز آیا جس میں آپ لوگ بھی خامہ فرسائی کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ ارے میاں! کٹ چھٹ، پھر تو وہ ڈراما من چہ می سرایم و طنبورہ چہ می سراید، کا مصداق ہوجائے گا۔ اس کے بعد تیسرا ڈراما انھوں نے ہماری انجمن کے لیے ''خان بہادر'' لکھا تھا۔ مگر عجیب بات یہ ہوئی کہ ادھر وہ ڈراما ختم ہوا اور اُدھر ہماری انجمن بھی ختم ہوگئی۔ انجمن کے بانی لاسلکی کے ناظم ہوگئے، منتظمین اور ڈائرکٹر الگ الگ نوکریوں سے جا چپکے، اور اداکار الگ اپنے اپنے دھندوں سے جا لگے۔ غرض یہ کہ سب طوطے کی طرح آنکھیں پھیر کر اڑ گئے اور اس مصنوعی اسٹیج سے منہ موڑ کر دنیا کے حقیقی اسٹیج پر اپنے اپنے پارٹ ادا کرنے میں جُٹ گئے۔

اب ان کی مصوری کا بھی کچھ حال سن لیجیے۔ انھیں مصوری اور نقشہ کشی کا بہت شوق تھا۔ دہلی کے مشہور و معروف مصور اُستاد عارف کے شاگرد بھی تھے۔ مگر یہ یاد رہے کہ ہماری آج کل کی مصوری اور مرحوم کی مصوری میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ہم آج کل کے رنگ پر چلتے ہیں اور وہ پرانے رنگ پر چلتے تھے۔ ہم چہرے پر لال پیلے دھبے مار کر چھوڑ دیتے ہیں اور وہ چہرے کے گرد بڑی احتیاط سے خط کھینچ کر رنگ آمیزی کرتے اور خاص خاص طریقوں سے رنگ بھرتے تھے۔ ہم بالوں پر کوئی بھی مناسب گہرا رنگ مار کر چھوڑ دیتے ہیں مگر وہ نقل مطابق اصل کے اصول پر چلتے اور رنگ میں رنگ ملا کر وہ بال کی کھال نکالتے کہ کوئی چاہے تو ایک ایک بال گن لے۔ مختصر یہ ہے کہ وہ بڑی محنت اور جاں فشانی سے تصویریں بناتے تھے اور انھیں جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

بہر حال وہ پچھلے زمانے کے مصوروں کے قایل تھے اور پرانے مصوروں پر دل و جان سے شیدا تھے۔ یہاں تک کہ وہ آج کل کے برشوں کو ہاتھ تک نہیں لگاتے تھے۔ جہاں کسی موٹی تازی گلہری کو دیکھتے تو منہ میں پانی بھر آتا، فوراً کہتے کہ میاں لپک، ذرا اس کی دُم تو توڑ لا، میں اور رحمت بھائی گلہریوں کی دُم کے پیچھے پڑے رہتے، بڑی بڑی ترکیبوں سے ان کو پکڑتے اور دُمیں توڑ توڑ کر اُن کی خدمت میں پیش کرتے رہتے۔ پھر وہ اُس کا برش بنا کر رنگ آمیزی کرتے تھے۔ کبھی کبھار رنگ بھرنے کے لیے میں اُن کا برش لینے کے لیے ہاتھ بڑھاتا تو فوراً ٹوکتے اور میرا ہاتھ روک کر کہتے کہ بس جناب! میرے برشوں پر رحم فرمائیے، یہ رنگ بھرنے کے ہیں تھوپنے کے لیے نہیں ہیں۔

تعلیمات سے عدالت العالیہ میں منتقل ہونے کے بعد کوئی دو سال تک مصوری کا زور رہا، اس کے بعد وہ ناظم ہو گئے، پھر تو ہاتھ پاؤں جھاڑ کر مقدموں کے پیچھے پڑ گئے اور رات دن فیصلوں پر فیصلے گھسیٹتے رہتے تھے۔ ان کی ترت پھرت کارروائیوں اور تیز فیصلوں سے وکیل خوش، سازشی سست اور اہلِ معاملہ چُست ہو گئے تھے۔ مقدمہ بازی کی گرم بازاری سے تمام مشغلے ٹھنڈے پڑ گئے تھے، بس مِی نویس و مِی نویس کا زور تھا جب کوئی کسی مقدمے کی سفارش کرنے آتا، تو کہتے تھے کہ بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔ ارے میاں اب کیا مُرے مُردے کو اکھاڑ رہے ہو، اس مقدمے کا فیصلہ کر کے تو مدتیں ہوئیں، زمانہ ہو گیا وہ پوچھتا کہ آخر فیصلہ کیا کیا ہے؟ تو کہتے کہ کل تم خود دفتر میں جا کر دیکھ لو، سب کچھ مثل میں موجود ہے اور یہ یقین جانو کہ کوئی بات رویدادِ مثل کے خلاف نہیں ہے۔

بہر حال مصوری کو خیر باد کر دیا، جو نقش و نگار مکمل تھے وہ فریم کر کے لٹکا دیے گئے جو نامکمل تھے یار لوگ ہاتھوں ہاتھ لے اُڑے۔ رنگ، برش اور کاغذ وغیرہ کچھ تو یہ کہہ کر مجھے دے دیے کہ "بخشود بروے دلِ شہر یار" اور بچے کچے رحمت بھائی کے حوالے کر دیے۔

بھائی فرحت کو کتب بینی کا بہت شوق تھا۔ ہراج خانوں سے، کباڑیوں کی دکانوں سے یا کتب فروشوں سے جب کوئی مزیدار کتاب مل جاتی تھی تو پھر تمام پروگرام منسوخ کر دیتے، یہاں تک کہ کھانا بھی برابر نہیں کھاتے تھے۔ چائے پیتے وقت ایک ہاتھ

میں چائے رہتی تو دوسرے ہاتھ میں کتاب، کھانا کھاتے تو نوالہ منہ میں رہتا اور آنکھیں کتاب پر جمی رہتی تھیں۔

مرحوم اُس زمانے میں کبھی کبھار ایک دو مضمون بھی لکھ مارتے تھے، مگر ایسے مضمون کبھی اپنے نام سے نہیں چھپواتے تھے اور مجھے سخت تعجب ہوتا تھا، جب کہ اُن مضمونوں کے ساتھ میں اپنا نام چھپا ہوا دیکھتا تھا۔ بعض اوقات مجھے ایسے خط بھی وصول ہوتے تھے، جن میں اُن مضمونوں کی تعریف ہوتی تھی اور اسی قسم کے مضامین روانہ کرنے کی فرمائش بھی کی جاتی تھی۔ اگر آپ "الحجاب" بھوپال کے رسالے دیکھیں تو اُس میں جتنے بھی مضمون چھپے ہیں وہ سب میرے ہی نام سے منسوب ہیں۔ رسالہ نمائش حیدرآباد دکن میں جو مضامین میرے نام سے شایع ہوئے ہیں اُن کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اسی طرح رسالہ "افادہ" حیدرآباد میں "ہم اور ہمارا امتحان" کے دونوں حصے میرے ہی نام سے چھاپے گئے ہیں، وہ بھی مرحوم کے ہی لکھے ہوئے ہیں۔

مجھے بھی مزاحیہ مضمون لکھنے کا شوق تھا اور ہم بھی اپنے آپ کو بڑا ظریف سمجھتے تھے ایک دن میرا مضمون سُن کر کہنے لگے کہ ارے میاں! ظریف کے معنی ہنسوڑے، مسخرے یاوہ گو اور بھانڈ کے تو ہیں نہیں، ظرافت تو خوش طبعی اور ذہانت کا نام ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ہماری حماقتیں اور عیوب دل کش طریقے سے بتائے جائیں اور سیاسی، سماجی اور ملکی اصلاح، دلچسپ طریقے سے کی جائے۔ ظرافت میں تو مذاق شستہ، پاکیزہ اور صاف ستھرا ہونا چاہیے، تم تو بھانڈوں کی ظرافت کے میدان میں اُتر آتے ہو، کبھی اپنا پیٹ پھلاتے ہو، کبھی پچکاتے ہو اور نیم برہنہ ہو کر تھرکنے لگتے ہو، اگر تمھاری یہی ظرافت ہے تو ایسی ظرافت کو ہمارا دور سے سلام ہے۔

میں کہتا تھا کہ بھئی! یہ نئے قسم کی ظرافت ہے کہ اُردو بھی سلیس اور بامحاورہ ہو، میدانِ سخن میں فصاحت کا گھوڑا بھی دوڑتا رہے، کسی کی توہین بھی نہ کی جائے، رکیک اور سوقیانہ الفاظ بھی نہ آئیں، خواہ مخواہ لطیفے اور چٹکلے بھی نہ ٹھونسے جائیں، اُلٹی سیدھی اور بے تکی باتیں بھی نہ کی جائیں تو پھر بھلا سیدھی سادی باتوں میں ظرافت کدھر سے آجائے گی

اور اس قسم کی باتیں سُن کر لوگوں کو کس طرح ہنسی آجائے گی۔ مگر بھائی فرحت برابر یہی کہتے تھے کہ بڑا کمال تو یہی ہے کہ واقعات سے مذاق پیدا کیا جائے اور واقعات کو اس انداز میں بیان کیا جائے کہ پڑھنے والے کو گدگداتے رہیں اور اُس کے دل و دماغ پر ایک انبساطی کیفیت پیدا کرتے رہیں۔ وہ کہتے تھے کہ مثلاً تم کسی بناوٹی آدمی کے حالات بیان کرو، کسی افیونی کو لو یا کسی بگڑے ہوئے نواب، یا غائب دماغ پروفیسر کے حالات بیان کرو، پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اُسے پڑھ کر کون خوش نہیں ہوتا۔ ارے میاں! جب تم اُن کی وضع قطع اور صورت شکل دیکھ کر ہنس پڑتے ہو تو پھر اُن کے تحریری جلیے اور واقعات کی تصویریں دیکھ کر نہ ہنسنے کے کیا معنی ہیں۔

اب سنیئے! اس عرصے میں میرے استاد حکیم معشوق علی خاں جوہر کا انتقال ہوگیا۔ حکیم صاحب ہر فن میں اُستاد تھے۔ سخن سنج، سخن فہم، ظریف الطبع، حکیم، وکیل، غرض کہ ہر فن مولا تھے۔ جس محفل میں بیٹھتے بلبلِ ہزار داستان کی طرح چہکتے رہتے تھے۔ بدیہہ گوئی کا یہ عالم تھا کہ قصیدے کے قصیدے ایک ہی بیٹھک میں لکھ دیتے تھے۔ اُنھیں مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم، بھوپال سے اپنے ساتھ حیدر آباد لائے تھے اور اُنھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ بہر حال اُن کا انتقال ہوا۔ مولوی سجاد میرزا صاحب (معتمد تعلیمات) اُن کی بڑی آؤ بھگت کرتے تھے اور حکیم جی بھی انھیں بڑی محبت اور عزت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ ایک دن سجّاد میرزا صاحب بیٹھے بیٹھے مجھ سے کہنے لگے کہ ارے میاں! حکیم جی کے حالات لکھ ڈالو، مگر خشک اور روکھے پھیکے رنگ میں نہیں، بلکہ جس طرح وہ خوش بیان، خوش دماغ، خوش زبان، خوش فکر، خوش سخن، خوش گفتار اور نازک مزاج تھے، بس اسی خوش اسلوبی اور نزاکت سے تم بھی اُن کی تصویر کھینچ ڈالو اور ساتھ ہی ساتھ انھوں نے مجھے دو چار انگریزی کتابیں بھی دیں اور کہا کہ پہلے انھیں اچھی طرح گھونٹ ڈالو اور پھر اسی رنگ میں ان کے حالات بیان کر جاؤ۔ میں اُن کے حالات لکھنے میں جُٹ گیا اور جب وہ مضمون ختم ہوا تو پھر بھائی فرحت کو جا کر سنایا۔ انھوں نے اسے بہت پسند کیا مگر کہنے لگے کہ اس میں اب بھی ضلع جگت کی بھرمار ہے اور علمی چاشنی کی کمی ہے۔ میں نے کہا کہ خیر، ضلع جگت کے معاملے میں تو بندہ لاچار ہے مگر علمی چاشنی کا فرمائیے کہ وہ کہاں سے لاؤں۔ کہنے لگے کہ یہ چاشنی گر گانو میں نہیں ملے گی، اس کے لیے تو اُستاد کی چلمیں بھرنی پڑتی ہیں۔ اچھا

جمعرات کی شام کو آ، میں تجھے لکھنے کی ترکیب بتاؤں گا۔ میں اس روز شام کے وقت یونہی گیا تو کیا دیکھتا ہوں، کہ تخت پر بیٹھے ہوئے ہیں، سامنے لیمپ جل رہا ہے، ایک طرف چھوٹا سا صندوقچہ رکھا ہوا ہے، دوسری طرف بہت سے کاغذ بکھرے پڑے ہیں اور خود بڑے زوروں پر لکھنے میں مصروف ہیں۔ میں نے پوچھا کہ بھائی کیا لکھ رہے ہو؟ کہنے لگے کہ سامنے آکر خاموش بیٹھ، اس وقت میں ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی لکھ رہا ہوں۔ میں نے ایک صفحہ اٹھا کر پڑھا تو کہنے لگے، میاں! کیا پڑھتا ہے، بس میں نے تو قلم توڑ دیا ہے۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ یہ ورق پر ورق رنگتے چلے جا رہے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ کہانی انھیں حفظ ہے اور یہ اُسے قلمبند کرتے چلے جا رہے ہیں۔ جب یہ مضمون شایع ہوا تو ہر طرف سے تعریف و تحسین کا شور بلند ہو گیا۔ مولوی عبدالحق صاحب اور مولوی غلام یزدانی صاحب نے دل کھول کر داد دی اور عظمت اللہ خاں مرحوم، سراج یار جنگ اور عنایت اللہ خاں مرحوم نے تو تعریف کے پُل باندھ دیے۔

فرحت اللہ بیگ کا تیسرا شاہ کار "دہلی کا مشاعرہ" ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اورنگ آباد کالج ڈے کے موقع پر اس مشاعرے کو اسٹیج کیا تھا۔ بھائی فرحت اسٹیج ڈائرکٹر تھے، یعنی اس مشاعرے کے تمام انتظامات اُن کے سپرد تھے۔ میں نے اُس ڈرامے میں غالب کا پارٹ کیا تھا۔ غالب کی ڈاڑھی، مونچھ، بھائی فرحت نے بنائی تھی۔ کلاہِ پاپاخ بھی انھوں نے ہی تیار کی تھی۔ ایک بر کا ریشمی پاجامہ ہاتھ سے قطع کر کے بنتا اور اپنے سامنے درزی سے سلوایا تھا۔ انگرکھا تیار کروایا اور جامہ وار کا چغہ بھی بنوایا تھا۔ غرض اس ٹھاٹھ سے ہم حیدرآباد سے اورنگ آباد روانہ ہوئے۔ وہ جلسہ کیا تھا، صلائے عام تھی یارانِ نکتہ داں کے لیے۔ حیدرآباد سے نواب مسعود جنگ، حیدر نواز جنگ، نثار یار جنگ، امین جنگ، فخر یار جنگ، معشوق یار جنگ، سب مدعو تھے۔ غرض کہ حیدرآباد کے جنگوں سے اسٹیشن ایسا پٹ گیا تھا کہ گویا فوج کسی محاذ پر جا رہی ہے۔ اسٹیشن پر ایک چہل پہل تھی۔ بھائی فرحت پارے کی طرح بے چین اور بے قرار تھے، کہ کب ریل چلے اور کب ہم اورنگ آباد میں جا دھمکیں۔ پالتا پہ پان کھا رہے تھے اور سگریٹ پر سگریٹ پی رہے تھے، کبھی درجے میں گھستے تھے اور کبھی پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگتے تھے۔

اس موقع پر ایک عجیب واقعہ پیش آیا، بھائی فرحت کی اُس وقت تک وحیدالدین سلیم سے یاد اللہ نہیں تھی، دونوں ایک دوسرے کے نام سے تو واقف تھے مگر صورت سے ناآشنا تھے وحیدالدین سلیم کو پتا چلا کہ میاں فرحت بھی اورنگ آباد جارہے ہیں اور فلاں ڈبے میں بیٹھے ہوئے ہیں، بس بے قرار ہو کر لپکے اور ڈھونڈھتے ڈھونڈھاتے، پتا لگاتے، ہانپتے، کانپتے اُن کے درجے تک جا پہنچے۔ بھائی فرحت اُدھر اپنے ڈبے سے نیچے اترے اور ادھر مولانا سلیم نے ایک کہی نہ دو بس لپٹ ہی تو گئے اور ایسے لپٹے کہ اب چھوڑتے ہیں نہ جب۔ بھائی فرحت نے بہت کوشش کی کہ اُس بوڑھے کے شکنجے سے نکلیں، مگر وہ کہاں چھوڑنے والے تھے۔ یہ جتنا زور کرتے اتنا ہی اُن کا شکنجہ مضبوط ہوتا چلا جاتا تھا۔ آخر بے اختیار ہو کر بولے، کہ خدا کے واسطے یہ تو بتاؤ کہ میں نے ایسا کون سا قصور کیا ہے جس کی یہ سزا دی جارہی ہے۔ کہنے لگے سب سے بڑا قصور تو یہ ہے کہ تم نے نذیر احمد کی کہانی لکھ دی ہے، خدا جانتا ہے فرحت! جب سے میں نے تمھارا وہ مضمون پڑھا تب سے ملنے کو دل تڑپ رہا تھا۔ بارے آج وہ مراد پوری ہوئی سچ تو یہ ہے کہ مضمون کیا لکھا گویا مرنے کے بعد تم نے نذیر احمد کو ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا۔ افسوس! ہمارا کوئی ایسا شاگرد نہیں، جو ہمارے مرنے کے بعد ہمیں بھی اسی طرح زندہ کردے بھائی فرحت نے کہا آپ فکر نہ کیجیے، اگر آپ کے کسی شاگرد نے یہ سعادت حاصل نہیں کی تو پھر میں اس کی تکمیل کر دوں گا۔ فرمایا سچ کہتے ہو نا؟ کہنے لگے اگر یقین نہ آئے تو بسم اللہ ابھی مر کر دیکھ لیجیے، اگر مضمون نہ لکھ دوں تو میرا نام فرحت نہیں۔ سلیم تو بلا کے زندہ دل آدمی تھے، ان باتوں سے اُن کے جسم میں زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ کھل کھلا کر ہنسے کہ فضا گونج گئی۔ اس کے بعد ریل چلی، یہ دونوں ایک ہی ڈبے میں گئے اور رات بھر گپیں اڑاتے رہے۔

مختصر یہ کہ ہنستے ہنساتے دوسرے روز اورنگ آباد پہنچے۔ شاید دوسرے روز رات کے وقت دہلی کا مشاعرہ اسٹیج ہوا۔ اُس کے کیا کہنے ہیں، نقل کو اصل کر دکھایا تھا، اور سچ تو اُس پر اتنا خرچ بیٹھا تھا اور قسمت سے ایسے ایسے موزوں لوگ گٹھ گئے تھے، کہ پھر کسی کو دوبارہ اسٹیج کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ہر شاعر کی وضع قطع، رنگ روپ، صورت شکل

نشست برخاست کا طریقہ، لباس اور طرز گفتگو کا خاص طور پر خیال رکھا گیا تھا اور ہر ایک نے ایسا سوانگ بھرا تھا کہ اصل اور نقل میں کوئی تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ اسٹیج پر قدم دھرتے ہی یار لوگ شور مچا دیتے تھے کہ وہ مومن خاں آئے، وہ غالب آ رہے اور وہ اُستاد ذوق تشریف لا رہے ہیں۔

اُس مشاعرے کی ایک تصویر میرے پاس پڑی رہ گئی ہے، اُسے آپ بھی دیکھیے اور شاعروں کو پہچانیے۔ اگر کوئی دقّت ہو تو بھائی فرحت کا مشاعرے والا مضمون پڑھ جائیے اور حلیے سے حلیہ ملا کر دیکھیے تو پھر آپ کے منہ سے بے اختیار واہ واہ نکل جائے گی۔

یہی وہ تصویر تھی جو مرحوم نے مہاراجہ کشن پرشاد آنجہانی کو دکھائی تھی۔ مہاراجہ بہادر خود بھی قدیم وضع قطع کے تھے، قدیم لوگوں کی عزّت کرتے تھے اور قدیم شعرا کو بڑی قدر اور محبّت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ انھوں نے اس تصویر کو بڑے غور سے دیکھا، کئی شاعروں کو پہچانا، پھر آب دیدہ ہوئے یہاں تک کہ آنسو رخساروں پر بہنے لگے۔ بھائی فرحت نے پہلے تو اِدھر اُدھر کی باتیں کرکے اُن کا دل بہلایا اور پھر ہر پھر کر اُس تصویر کے متعلق رائے دریافت کی تو فرمانے لگے کہ یہ بھی اُس مصوّرِ حقیقی کی قدرت تھی کہ ان تمام شعر و سخن کے بادشاہوں کو ایک جگہ جمع ہونے کا موقع دیا، پھر یہ تصویر لی گئی، وہ تمھارے پاس پہنچی، اُسے دیکھ کر پھر تم نے مشاعرہ لکھا اور پھر آج ہمیں اُن کی زیارت کرنے کا موقع ملا — بھائی فرحت نے کہا کہ جناب! یہ بزرگ اصلی نہیں ہیں، یہ تو سب کے سب نقلی ڈاڑھیاں لگا کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد اُس مشاعرے کے پورے واقعات بیان کیے تو مہاراجہ بہادر بہت مسکرائے اور فرمایا کہ میرزا صاحب! یہ مشاعرہ تو ہمارے محل میں بھی کیجیے، اسے دیکھ کر میرا دل تو تڑپ گیا۔ بھائی فرحت نے حامی تو بھر لی مگر اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے۔ یہ بھی ایک تاریخی واقعہ ہے جس کا انشاءاللہ پھر کبھی انکشاف ہوگا۔

ہاں، میں نذیر احمد کی کہانی کے متعلق ایک بات کہنی تو بھول ہی گیا۔ بھائی فرحت کہتے تھے، کہ ایک بار میں اپنے ایک دوست سے ملنے گیا، کیا دیکھتا ہوں کہ وہیں ایک مُلّا صاحب سر پر نکو عمامہ باندھے، سفید جُبّا ڈانٹے ایک لڑکے کو پڑھا رہے ہیں۔ وہ بزرگ بعض بعض

شعروں کے تو ایسے اُلٹے سیدھے اور غلط سلط معنی پہنا رہے تھے، کہ اگر مولانا حالی کہیں سن پاتے تو اپنا سر پیٹ لیتے، یا صائب کی طرح یہ کہہ اٹھتے، کہ "شعر مرا بہ مدرسہ کہ بُرد" چنانچہ لڑکے نے یہ مصرع پڑھا کہ "سانڈے تھے بلوں میں منہ چھپائے" پوچھا مولوی صاحب! یہ سانڈے کے کیا معنی ہیں؟ مُلا صاحب نے سانڈے کی طرح سر ہلا کر فرمایا، کہ سانڈے سانڈ کی جمع ہے جیسے بھینس سے بھینسے، مرغ سے مرغے اور سانڈ سے سانڈے۔ پھر کہنے لگے، کہ یہ مصرع اس طرح بھی لکھ سکتے تھے کہ "تھے سانڈ بلوں میں منہ چھپائے" مگر مولانا حالی پرانے زمانے کے شاعر ہیں اس لیے انھوں نے یہاں بھی پرانی جمع کو برقرار رکھا ہے۔

بالکل اسی طرح کا واقعہ میرزا فرحت اللہ بیگ کے مضمون کے ساتھ پیش آیا، ان کا نذیر احمد کی کہانی والا مضمون بی۔ اے کے کورس میں داخل تھا۔ اس مضمون میں مولوی غلام یزدانی صاحب (سابق ناظم آثارِ قدیمہ حیدر آباد دکن) کا پورا نام لینے کی بجائے جگہ جگہ اس طرح لکھ دیا ہے کہ دانی نے کہا، اور دانی میرے ساتھ تھے، دانی نے آواز دی وغیرہ۔ پروفیسر صاحب پڑھا رہے تھے، ایک طالب علم نے پوچھا کہ جناب! یہ دانی کون صاحب ہیں؟ پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ دانی کسی شخص کا نام نہیں ہے، یہ لفظ دانستن سے مشتق ہے اور اس کے معنی ہیں آگہی۔ پرانے شعراء اور علمائے متقدمین اپنے شعروں میں لفظ ہاتف لاتے تھے، میرزا فرحت اللہ بیگ دورِ جدید کے شاعر ہیں اور علمائے متاخرین سے ہیں، اس لیے آپ نے بجائے ہاتف کے دانی کو اپنا دوست بتایا ہے، جس کے معنی ہیں آگہی (یا جانتا ہے تو) چنانچہ ایرانی شاعر کہتا ہے کہ، ندا آمد یا ہاتف گفت، مگر یہ دورِ جدید کا ادیب کہتا ہے کہ دانی نے کہا۔ بس صاحب موصوف نے بجائے لفظ ہاتف کے دانی استعمال فرمایا ہے یعنی "آگہی یعنی عقل" اسے نوٹ کر لو۔

لوگوں کی تابڑ توڑ فرمائشوں سے مرحوم نے اپنے مضمونوں کی پہلی جلد مضامین فرحت کے نام سے چھاپی۔ مجھ سے کہنے لگے میاں! ایک صفحہ خالی ہے۔ میں نے کہا اب کیا ہوگا؟ کہنے لگے تاریخ کہنا جانتا ہے؟ میں نے کہا تاریخ پیدائش سے آج تک تو تاریخ تو کہی نہیں، مگر دیکھیے کوشش کرتا ہوں۔ گھر آیا، اِدھر اُدھر رات بھر جال ڈالتا رہا، اور صبح ہوتے ہوتے ایک مادۂ تاریخ

دامِ فکر میں پھانس لایا۔ دوسرے روز علی الصباح اُن کے پاس پہنچا اور قطعہ تاریخ کہہ سنایا، وہ آپ بھی سُن لیجیے ۔

مضامینِ فرحت کی شیرینیاں　　بڑھاتی ہیں پڑھنے کی دل میں ہوس
روانی بلا کی عبارت میں ہے　　ظرافت بھرے ہیں وہ مضموں کہ بس
پڑھو ایک جملہ تو گھنٹوں ہنسو　　ظرافت بھی سن سن کے کہتی ہے بس
کہی ہم نے بھی اس کی تاریخ طبع　　نہیں گرچہ عصمت کو اس فن سے مس

ہے تاریخ کیا بے بہا لاجواب
کہ اک بار پڑھو اور دس بار ہنس

انھوں نے فوراً مادۂ تاریخ کا پوسٹ مارٹم کیا تو دیکھا کہ ۱۳۳۷ف برابر آ رہے ہیں۔ بہت خوش ہوئے۔ پھر کہنے لگے کہ میاں! تاریخ تو خوب کہی ہے، مگر عیب یہ ہے کہ تم نے اوپر کہیں اشارہ بھی نہیں دیا کہ اِس سے سنہ فصلی نکلتا ہے، دوسرے ہندوستان کے لوگ فصلی کیا سمجھیں گے، اُن کے لیے تو ہجری سنہ ہونا ضروری ہے۔ میں تو اسی شش و پنج میں رہا کہ نو عدد کس طرح بڑھاؤں اور فصلی کو ہجری کیسے بناؤں۔ مگر انھوں نے ایک کہی نہ دو، فوراً چوتھے شعر کا پہلا مصرع "کہی ہم نے بھی اُس کی تاریخ طبع کو کانٹ چھانٹ کر اس طرح کیا" "کہی سالِ فصلی میں تاریخ طبع" اور آخر میں یہ شعر اضافہ کر دیا ۔

جو درکار ہو سنہ ہجری تمھیں
اسی پر اضافہ کرو نو و دس

مضامینِ فرحت کی پہلی جلد چھپی اور ہاتھوں ہاتھ ختم ہو گئی۔ پھر مضامینِ فرحت کا دوسرا حصہ چھپا، تیسرا چھپا، چوتھا چھپا، یہاں تک کہ یہ عدد سات حصوں تک جا پہنچا، اور اب بھی خدا کے فضل سے اتنا مال مسالا موجود ہے کہ دو تین جلدیں اور طبع ہو سکتی ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ بہترین مزاح نگار تھے۔ اس قسم کے مضمون لکھنے والوں میں پطرس، رشید احمد صدیقی، عظیم بیگ چغتائی، ایم اسلم، سندباد جہازی، شوکت تھانوی اور ملّا رموزی بہت مشہور ہیں۔ اگر آپ سلاست زبان اور حسنِ بیان کے چٹخارے لینا چاہیں اور مرقع نگاری

کے دلچسپ نمونے یا ہماری قدیم تہذیب و تمدن اور پرانے لوگوں کی چلتی پھرتی تصویریں دیکھنی چاہیں تو میرزا فرحت اللہ بیگ کے مضمون پڑھیے۔ ان میں ظرافت کے ساتھ کیاست اور ذہانت بھی ہے اور مضمون نگاری کے بہترین نمونے بھی ہیں۔ جس مضمون کو اٹھا کر دیکھیے کس کس خوبی سے ان کے خدوخال نمایاں کیے ہیں اور کس کس نزاکت سے مختلف مناظر پیش کیے ہیں کہ ایک بار مصور بھی دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے اور کارٹونسٹ بھی دیکھ کر بے اختیار ہنس پڑتا ہے۔

ظرافت اور خوش مذاقی تو مرحوم میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ ہر چیز کو ظریفانا رنگ میں دیکھتے تھے اور اُسے دلچسپ اور لطیف انداز میں بیان کر جاتے تھے، جسے سُن کو خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ جاتی تھی۔

مرحوم تابڑ توڑ مضمونوں پر مضمون لکھنے لگے اور دھڑا دھڑ مضامین کے حقوں پر حصے چھپنے لگے تو بعض اہلِ قلم جل اٹھے اور اُن کے خلاف محاذ تیار کرنے لگے۔ مرحوم کو سب خبر تھی مگر ان کے خلاف میں زبان تک نہیں ہلاتے تھے اور ان کی شان کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک صاحب تشریف لائے اور کہنے لگے کہ میرزا صاحب! آپ نے اپنے متعلق کچھ اور بھی سُنا۔ کہنے لگے سُنا تو بہت کچھ ہے، مگر اب تم اتنی دور سے آئے ہو تو خالی ہاتھ کیوں جاؤ، تم بھی کچھ سُنا جاؤ۔ کہنے لگے فلاں صاحب نے آپ کے متعلق یہ ریمارک کیا ہے کہ فرحت کو تو ہیضہ ہو گیا ہے۔ ہنس کر کہنے لگے کہ اگر یہ بات ہے تو بابا! ہم دنیائے ادب سے جاتے ہیں، خدا کے واسطے تم ہی زندہ رہو اور ہمیشہ تحریر کے قبض میں مبتلا رہو۔

جب مرحوم نظامت سوم عدالت پر ناظم ہو کر گئے تو ایک صاحب مبارکباد دینے آئے اور پوچھا کہ آپ کہاں کی نظامت پر گئے ہیں؟ کہنے لگے، اب میں تھرڈ کلاس کی نظامت پر مقرر ہو گیا ہوں اور آج سے تھرڈ کلاس مجسٹریٹ بن گیا ہوں۔

ایک صاحب تشریف لائے اور انھوں نے اپنی کتاب پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی۔ اس کے دو چار مضمون دیکھے، پھس پھسے سے تھے، کہنے لگے میاں! مقدمہ تم خود

لکھ ڈالو اور میرے نام سے چھپوا دو، کہا، مگر آپ کا رنگ کیسے آئے گا؟ کہنے لگے، میرے رنگ کی فکر مت کرو، تم تو ایسا رنگ اختیار کرو جس میں تمھارا رنگ جم جائے۔

ایک مرتبہ ایک صاحب سر ہو گئے کہ فلاں عنوان پر ایک مزاحیہ مضمون لکھ دیجیے کہنے لگے کہ میاں تم خود لکھو۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ کہنے لگے کیا سوچتے ہو، اس طرح شروع کرو، یہ لکھو، یوں ختم کر دو، اللہ اللہ خیر سلاّ۔ کہا کہ یہ آپ ہی لکھ دیجیے۔ کہنے لگے کہ میں تو اب خوش مذاقی کی فوج کا بوڑھا کمانڈر انچیف ہوں، لڑتا نہیں لڑاتا ہوں، تم جوان ہو، دماغ لڑاؤ، مجھ سے اچھا لکھ سکو گے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ وہ فصاحت جنگ اُستاد جلیلؔ سے ملنے جا رہے تھے، میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ اُن کے پاس اختر یار جنگ مرحوم بیٹھے ہیں اور دو چار شاعر اور بھی تھے۔ اختر یار جنگ نے ایک شعر پڑھا، جس میں فکر کو مونث باندھا تھا۔ اُستاد جلیلؔ نے مسکرا کر بھائی فرحتؔ سے پوچھا، کہ فکر کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ کہنے لگے جناب! میں تو دونوں طرح باندھتا ہوں۔ فرمایا وہ کیسے؟ تو کہنے لگے کہ جب دیکھتا ہوں کہ واقعی کوئی زبردست فکر آ پڑا ہے تو اُسے مذکّر باندھتا ہوں اور اگر کوئی چھوٹی موٹی معمولی فکر ہے تو پھر اسے مونث باندھ جاتا ہوں۔

شاعری تو بھائی فرحتؔ کے رگ و ریشے میں تھی اور ورثے میں آئی تھی۔ غالبؔ، مومن خاں، حکیم آغا جان عیشؔ، خواجہ میر دردؔ، اور سعادت یار خاں رنگینؔ سے نزدیک کا رشتہ تھا، بھر پورے کا پورا خاندان شاعر تھا۔ چچا عنایت اللہ بیگ شاکرؔ، چچا عبدالصمد بیگ فاکرؔ، خواجہ قمرالدین خاں راقمؔ (خلف خواجہ بدرالدین خاں مترجم بوستانِ خیال) چچا رفیع الدین وحشیؔ، میرزا ساجد بیگ، سب کے سب شاعر اور صاحب دیوان ہیں۔ اس حساب سے اگر دیکھا جائے تو بہ قول شخصے بھائی فرحتؔ نے شاعری کی گود ہی میں پرورش نہیں پائی تھی بلکہ اُس کے کاندھوں پر بھی کودے ہیں، توند پر بھی اُچکے ہیں اور دولتیاں بھی جھاڑی ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کرزن کے دربار کے موقع پر دہلی شاعروں کا اکھاڑا بنی ہوئی تھی۔ ہمارے گھر میں (حویلی ڈپٹی سلطان خاں) ہر مہینے مشاعرہ ہوتا تھا اور اس مشاعرے میں

بھائی فرحت بھی اپنی غزل پڑھا کرتے تھے اور وہ زوروں پر پڑھتے تھے کہ محفل پر چھا جاتے تھے اگر دبتے تھے تو صرف آغا شاعر دہلوی سے، اس کی آواز اس بلا کی تھی اور پڑھنے کا انداز اس غضب کا تھا کہ بے اختیار سامعین کے منہ سے واہ واہ نکل جاتی تھی۔

بھائی فرحت کہتے تھے کہ میاں! اس جم غفیر میں غزل وزل کون پرکھتا ہے اصل چیز تو غزل پڑھنا ہے، جو پڑھنے میں دبنگ ہوگا وہی سب کو دبالے گا۔ کہتے تھے کہ اگر غزل کمزور ہے تو گا کر پڑھو اور کہیں سکتہ ہو تو کسی لفظ کو کھینچ تان کر پڑھ جاؤ کسی کو غلطی کا پتا بھی نہیں چلے گا۔ وہ لَے سے بھی خوب پڑھتے تھے، آواز رسیلی اور پاٹ دار تھی، خود ایک مقطع میں کہتے ہیں؎

بزمِ غنا ہیں فرحت اردو کے سب مشاعرے

وہی غزل پڑھا کرے تھوڑا بہت جو گا سکے

تحت اللفظ آغا شاعر کے ڈھنگ پر پڑھتے تھے اور اس کا یہی راز بتاتے تھے۔ ایک مرتبہ آغا شاعر نے غزل پڑھی، لوگوں نے وہ گلے پھاڑ پھاڑ کر تعریفیں کیں کہ آوازیں بیٹھ گئیں اور خاص کر اس شعر کو تو کئی بار پڑھوایا ؎

ہر بُنِ مو پہ رکھے ہیں اس نے تلواروں کے مُنہ

کر رکھا ہے اس نے دامن چاک یہ چک میرے لیے

مشاعرہ ختم ہوا تو مرحوم آغا شاعر سے کہنے لگے کہ ارے میاں! تمھارا یہ شعر تو بالکل پلپلا سا ہے اس کا تو کوئی مطلب نہیں، آپ استاد مانے جاتے ہیں، ایسے شعروں سے آپ کے نام پر بٹا لگے گا۔ آغا صاحب نے ہنس کر جواب دیا کہ لوگوں کو آزمانے کے لیے غزل میں ایک دو شعر ناسخ کے رنگ کے بھی ہونے چاہئیں تاکہ اہلِ مشاعرہ کی سخن فہمی کا اندازہ ہو سکے۔

شاید دہلی دربار کے کچھ عرصے کے بعد ہی مولانا حسرت موہانی نے علیگڈھ میں ایک زبردست مشاعرہ کیا تھا، یہ کل ہند مشاعرہ تھا۔ اس وقت بھائی فرحت کی عمر کوئی اٹھارا انیس سال کی ہوگی۔ یہ بھی اپنی غزل دبائے ہوئے پہنچے اور وہاں پہنچ کر ایک نہیں بلکہ دو غزلیں مسلسل پڑھیں اور اس ٹھاٹھ سے پڑھیں کہ مشاعرہ واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعروں سے گونج اٹھا۔ اس غزل کے دو تین شعر اب تک مجھے یاد ہیں، وہ آپ بھی سن لیجیے ؎

موت تو آہی چکی تھی وقت پر یار آگیا ڈوبتے کو ایک تنکے کا سہارا ہوگیا
مجھ مریضِ عشق کا کرنے کو آئے ہیں علاج لو طبیبوں کی خبر ان کو بھی سودا ہوگیا

نیم جاں پہلے تھا فرحتؔ اور ہوئی فرقت نصیب
اونگھتے کو ٹھیلتے کا اک بہانا ہوگیا

یہ تھی ان کی دہلی میں شاعری، اب چاہے اسے تلبیس شخصی کہیے یا ہاتھی کے دانت سمجھیے، مگر یہ ضرور ہے کہ اصلی شاعری حیدر آباد آنے کے بعد شروع ہوئی۔ یہاں معشوق علی خاں جوہرؔ تھے، خورشید حسین خاورؔ تھے اور کئی اچھے اچھے شاعر تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ بعض ایسی غزلوں کا ذکر چھڑ گیا جو سخت اور سنگلاخ زمینوں میں کہی ہوئی تھیں۔ ایک صاحب نے شاہ نصیر کی وہ غزل سُنائی جس کا مصرع ہے۔ ع

"نہاں ہے کب چشمِ ہر بشر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں"

اس غزل کے ختم ہونے کے بعد ایک صاحب نے ایک مصرع موزوں کرکے پڑھا۔ ع

"نظامِ شمسی ہوا ہے ابتر فلک پے پتھر زمیں پے تارے"

اور زمین آسمان کے قلابے ملانے لگا۔ بھائی فرحتؔ اُٹھ کر ٹہلنے لگے، پھر گھر میں گئے اور خدا جھوٹ نہ بلائے کوئی دس بارہ شعر لکھ کر لے آئے مجھے اس کے دو شعر یاد رہ گئے ہیں وہ آپ بھی سن لیجیے۔

جو آہ نکلے ہمارے دل سے تو دونوں عالم کا ہو یہ عالم
فلک زمیں پر، زمیں فلک پر، فلک پہ پتھر زمیں پے تارے

پہاڑ سوزِ دروں سے اُڑ کر ہوے زمیں کی کشش سے باہر
نظامِ شمسی ہوا ہے ابتر، فلک پے پتھر زمیں پے تارے

خدا معلوم یہ شعر انھیں پہلے سے یاد تھے یا فی البدیہہ کہہ ڈالے تھے۔ بہر حال اس غزل کی بڑی تعریفیں ہوئیں، مگر ہمارے حکیم جی کو جوش آگیا، میری طرف اشارہ کرکے کہنے لگے کہ آپ مشکل سے مشکل طرح عصمتؔ کو دیں اگر وہ غزل نہ لکھے تو آپ اُس کی ناک کاٹ لیں۔ مرحوم نے کہا کہ قبلہ! اگر اسی قسم کی دو چار شرطیں آپ بدلیں گے تو چند روز میں خدا نے چاہا تو اس کی ناک جڑ سے غائب ہو جائے گی۔

حکیم جی کسی سے نہیں دبے اور اگر دبے تو بھائی فرحت سے۔ وجہ یہ تھی کہ پہلے تو مرحوم کو مستند شعراء کے سینکڑوں شعر یاد تھے، دوسرے قدیم اُستادوں کے دیوان اُن کی نظر سے گزر چکے تھے اور تیسری بات یہ کہ عروض و قافیہ اور بیان و معانی کا خود بھی گہرا مطالعہ کیا تھا اور اُستادوں سے بھی پڑھا تھا۔ انھیں زبان پر عبور تھا اور محاوروں پر پوری طرح حاوی تھے۔ مولوی غلام یزدانی صاحب جب ان کے کسی شعر یا مضمون میں کوئی کمزور لفظ دیکھتے تو فوراً ٹوک دیتے تھے۔ کبھی جی میں آیا تو اُس لفظ کی جگہ کوئی دوسرا لفظ بٹھا دیتے تھے اور کبھی اڑ جاتے تو اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے، وہ اپنی بات کی ہی پیچ کرتے رہتے۔ سند میں دو چار شعر بھی پڑھ دیتے اور کہتے تھے کہ دہلی میں برابر یہی بولتے ہیں اور یہ بالکل فصیح ہے۔ وہ کہتے تھے کہ بولتے تو ضرور ہیں، مگر اسی لفظ کو موقع اور محل سے استعمال کیا جائے تو فصیح ہے مگر یہاں تو یہ لفظ مصنوعی سا معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال نہ تو کسی دوسرے میں اتنی ہمت تھی جو انھیں ٹوکے اور نہ وہ کسی کی مانتے تھے۔ اگر کوئی دوسرا شخص اُن کے خلاف کسی کی سند پیش کرتا تو کہتے تھے کہ میاں! تم دوسروں کی سند کیا دیتے ہو، یہ بھی جانتے ہو کہ ہم کس خاندان سے ہیں، ہماری بات خود سند ہے۔ غرض یہ کہ مولوی غلام یزدانی صاحب سے اُنھیں بڑی محبت اور بڑی عقیدت تھی، اُن کے متعلق ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

میرے اندازِ روش پر بہرِ اصلاح خیال

محتسب سے کم نہیں فرحت مرا دانی مجھے

میرزا فرحت اللہ بیگ نہایت پُرگو اور فی البدیہہ کہنے والے شاعروں میں سے تھے۔ ان کی مثال ایک ایسے درخت کی سی ہے، جسے ذرا ہلا دو اور بیسیوں پکے پھل چن لو۔ اکثر شعرا طرح کے خلاف ہیں اور اسے شعر و سخن کی مشق کا پہلا زینہ سمجھتے ہیں۔ جس طرح ابتدا میں بچوں کو کنکھنے ڈال کر الف، بے لکھنا سکھاتے ہیں یا نئے رنگروٹ کو رائٹ لیفٹ کی آواز پر قدم ڈالنے کی مشق کراتے ہیں، بس اسی طرح نوسکھ یا مبتدی شاعر کو طرح دے کر طبع آزمائی کراتے ہیں اور میدانِ سخن میں کاوے دیتے رہتے ہیں، بھائی فرحت بھی طرح کے بالکل خلاف تھے بلکہ میرا تو دعوےٰ ہے کہ سب سے پہلے شاعر فرحت اللہ بیگ ہیں جنھوں نے دہلی کا مشاعرہ لکھ کر قدیم طرحی مشاعرے کے طریقے کو توڑا اور غیر طرح مشاعرے کا ڈول ڈالا۔ ان تمام باتوں کے باوجود وہ ریڈیو کی آواز

گراموفون کے ریکارڈ، فقیروں کی صداؤں اور سودا سلف بیچنے والے لمڈوں اور راہ گیروں کی آوازوں پہ کان لگائے رہتے تھے، جہاں کوئی اچھی لے یا شگفتہ زمین کان میں پڑی اور فوراً غزل یا نظم لکھنے بیٹھ جاتے تھے۔

ایک مرتبہ بچے گراموفون بجا رہے تھے، کسی نے علی حسین نابینا کا گایا ہوا ریکارڈ "اشربو، اشربو، اشربو، اشربو" لگا دیا، بس میرزا صاحب کو جوش آگیا۔ قلم دوات لے کر بیٹھے اور اُسی وقت دس بارہ بند کہہ ڈالے۔ دو ایک بند آپ بھی سُن لیجیے ؎

میرے دل میں ہے بس اک، یہی آرزو　　سب بھرے میکدے کے ہوں جام و سبو
اور کہے مجھ سے وہ ساقیٔ شعلہ رو　　"میں بھی دیکھوں بھلا کتنی پیتا ہے تو"
"اشربو، اشربو، اشربو، اشربو"

ایسا دیکھا نہ ہوگا تماشہ کوئی　　ہے قیامت جو رہ جائے تشنہ کوئی
ختم ساقی نے کر دی ہے دریا دلی　　دوش پہ خم ہے اور یہ صدا کو بکو
"اشربو، اشربو، اشربو، اشربو"

ایک مرتبہ سجاد میرزا صاحب نے نظام انتھم کا آزاد ترجمہ کرنے کا اعلان کیا اور شاید اس کے لیے دو یا تین سو روپیے انعام بھی مقرر کیا تھا۔ اُس زمانے میں سجاد میرزا صاحب عثمانیہ ٹریننگ کالج کے پرنسپل تھے اور اُس سال کئی ایسے مدرسین ٹریننگ حاصل کرنے کے لیے اضلاع سے آگئے تھے، جنھیں شعر و شاعری سے دلچسپی تھی، ان کا خیال تھا کہ ٹریننگ کالج کے طلبا یا مقامی شعرا دماغ لڑائیں گے۔ اس طرح نئی نئی نظمیں بھی دیکھنے میں آئیں گی۔ طلبا کی امداد بھی ہو جائے گی اور ایک اچھا تماشا تیار ہو جائے گا۔ بس اس اعلان کے دوسرے روز ہی یہ اپنا ترجمہ لے کر ٹریننگ کالج پہنچے، لے بٹھائی، ریکارڈ تیار کرایا اور جو کچھ اُنھیں انعام ملنا چاہیے تھا وہ دوسروں کو دلوا دیا، وہ ترانا بھی سُن لیجیے ؎

اس پہ ہے حق مہرباں　حق کا ہے وہ پاسباں　عقل کی ہے رہبری　ساتھ ہیں امن و اماں
شاہِ دکن زندہ باد

دل سے ہے اس پہ فدا　ملک کا چھوٹا بڑا　سب کا محافظ ہے وہ　اس کا محافظ خدا

شاہِ دکن زندہ باد

سب کا وہ سردار ہے مونس و غمخوار ہے رحمتِ پروردگار اس کی مددگار ہے

شاہِ دکن زندہ باد زندہ و پاینده باد

یہ شاعری انھیں کیسے آئی! بس خود بہ خود آگئی، نہ تو وہ کسی کے شاگرد تھے اور نہ وہ شاعری کے معاملے میں اُستادی اور شاگردی کے قایل تھے۔ کہتے تھے میاں! یہ بھی کوئی گانے بجانے کا فن ہے کہ کہیں اُستاد نے گٹکری بتادی اور کہیں تال سُر درست کردیا۔ شاعری تو ایک کیفیت ہے جو دل پر طاری ہوتی ہے اور شاعر اپنی زبان میں ادا کر جاتا ہے۔ اب رہی زبان اور محاورے تو اس حد تک خیر اُستاد اپنے استادی ہاتھ بتا سکتا ہے، ورنہ شاعری کے لیے تو اُس کی بھی ضرورت نہیں ہے، شاید یہی سبب تھا کہ وہ کسی ایک رنگ پر نہ ٹک سکے اور بہ قول شخصے بے لگام ہو کر میدانِ شاعری میں سرپٹ دوڑنے لگے۔ ان کا دیوان دیکھو تو ایک گلدستہ ہے جس میں رنگ رنگ کے پھول نظر آتے ہیں۔

مہاراجہ کشن پرشاد آنجہانی مرحوم کو بہت چاہتے تھے اور طرح طرح سے ان کا دل بڑھاتے تھے۔ مہاراجہ بہادر کے محل میں ماہانہ ایک مشاعرہ خاص ہوتا تھا، جس میں منتخب اور خاص خاص چوٹی کے شعرا شریک ہوتے تھے۔ دو طرحی مصرعے دیے جاتے تھے، ایک فارسی کا اور دوسرا اُردو کا۔ پھر عابد حسین بیگم ریختی خوب کہتے تھے اور کیوں نہ کہتے، تمام عمر یہی پاپڑ بیلے تھے، لکھنؤ میں پرورش پائی تھی اور ریختی گوئی ورثے میں آئی تھی۔ شاید ایک صاحب مزاحیہ رنگ میں بھی خوب کہتے تھے۔

اب اس مشاعرے کا حال سنیے۔ دوسرے شاعر تو ایک یا دو غزلیں پڑھ کر بیٹھ جاتے، مگر مرحوم تین تین اور چار چار غزلیں پڑھا کرتے تھے۔ فارسی میں الگ، ریختے میں الگ، ریختی میں الگ، اور مزاحیہ رنگ میں الگ۔

ریختہ ملاحظہ ہو ؎

ہوں مشتِ خاک لیکن ہستی کی داستاں ہوں — دیکھو تو کچھ نہیں ہوں سمجھو تو اک جہاں ہوں

کس طرح قافلے کے ہمراہ چل سکوں میں — وہ اُٹھ کے بیٹھ جائے وہ گردِ کارواں ہوں

آزادیٔ حقیقی ملتی ہے کس کو بلبل ۔۔۔ تو ہے قفس میں اور میں پابندِ آشیاں ہوں

خیر، ریختے کے تو کیا کہنے ہیں، اب ذرا ان کی ریختی اور مزاحیہ رنگ ملاحظہ فرمائیے کہ کتنا پختہ ہے۔ بیگم سن کر اچھل پڑے، خواجہ حسن نظامی لوٹ ہو گئے اور مہاراجہ بہادر تو کہنے لگے کہ آج واقعی معلوم ہوا کہ ریختی کسے کہتے ہیں۔ ذرا ملاحظہ ہو کہیں ایک بھی رکیک یا سوقیانہ لفظ ہے

کیا ہی غضب دیکھ بوا ہو گیا ۔۔۔ سامنا آج اُن کا مرا ہو گیا

چھوڑتی میں اور بھلا اُن کا ہاتھ ۔۔۔ تھا یہی قسمت میں بدا ہو گیا

ہوک سی کیوں اُٹھتی ہے دل میں مرے ۔۔۔ کیا وہ کہیں مجھ سے خفا ہو گیا

خیر سے اللہ انھیں لائے یہاں ۔۔۔ ہولوں سے یہ حال مرا ہو گیا

مجھ کو تو خانم ہے بس ایک ہی ۔۔۔ دُور نگوڑی تجھے کیا ہو گیا

کیا ہی مچائی بوا فرحت نے دھوم
نون جو سالن میں ذرا ہو گیا

اس طرح تابڑ توڑ غزلوں پر غزلیں لکھنے اور شاعری کی ہر صنف اور ہر رنگ میں طبع آزمائی کرنے سے نظموں اور غزلوں کا انبار لگ گیا اور وہ زبردستی کے شاعر بن بیٹھے۔

مرحوم مرتے دم تک برابر اُردو کی خدمت کرتے رہے۔ مرنے سے دو دن پہلے اردو مجلس کا جلسہ انھوں نے خود اپنے گھر پر ہی کیا تھا۔ نواب مقصود جنگ بہادر نے آغا حشر کاشمیری پر مقالہ پڑھا تھا اور مرحوم نے بہت لہک لہک کر اپنی ایک غزل سنائی تھی جو غالب کے رنگ میں تھی۔ بہ قول سجاد میرزا صاحب یہ اُن کا سوان سانگ تھا۔ اس کے دو تین شعر آپ بھی سن لیجیے

دل مرا روزِ ازل سے بے قرارِ نغمہ ہے ۔۔۔ ہر نفس اُس کے لیے آوازِ تارِ نغمہ ہے

یہ نہیں آوازِ مطرب ہے رواں اک جوئبار ۔۔۔ تان جو اس میں ہے گویا آبشارِ نغمہ ہے

میں کہاں فرحت کہاں اس طرزِ غالب میں غزل
یہ مگر روزِ ازل کا ہی خمارِ نغمہ ہے

یہ عجیب بات ہے کہ جلسہ ختم ہونے کے بعد ہی آیندہ کے جلسے کے پورے انتظامات سجاد میرزا صاحب کے سپرد کیے اور کہا دیکھو بھائی! آیندہ مہینے کا جلسہ نہ کرنا، گویا یہ اُن کی

آخری وصیت تھی، اس کے بعد کوئی تیس گھنٹے اور جیے اور دوسرے روز اتوار کے دن ۲۶ر اور ۲۷ر اپریل کی درمیانی شب میں وہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ مولوی مسعود علی صاحب محوؔی نے تاریخ کہی ؎

تھے فرحتؔ بڑے پہلوانِ سخن — زبانِ معانی تھے جانِ سخن
جو وہ اُٹھ گئے اُٹھ گئی اُن کے ساتھ — بہارِ زباں، عزت و شانِ سخن
عنادل خزاں آ گئی باغ میں — گیا بلبلِ گلستانِ سخن
۱۹۴۷ء — ۱۳۶۶ھ

میرزا عصمت اللہ بیگ عصمت

آکا

میرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کو کوئی مولوی میرزا فرحت اللہ بیگ فرحتؔ، کوئی ادیب الملک میرزا فرحت اللہ بیگ، کوئی میرزا فرحت اللہ بیگ چغتائیؔ اور کوئی فرحت الملک میرزا فرحت اللہ بیگ کہتا اور لکھتا تھا۔ چند ایسے بھی خاص لوگ ہیں، جو ان کو ''آکا فرحت'' کہتے تھے۔ مجھ سے چونکہ وہ عمر میں بڑے تھے اور ہمارے ہاں بڑے بھائی کو آکا کہتے ہیں، میں اُن کا نام نہیں لیتا تھا، بلکہ صرف ''آکا'' کہا کرتا تھا۔ اس لیے اس مضمون کا عنوان بھی میں نے ''آکا'' ہی رکھنا مناسب سمجھا۔

''آکا'' کے انتقال کے بعد (خدا اُن کی مغفرت فرمائے) شمالی ہند یا حیدر آباد کا شاید ہی کوئی اردو اخبار یا رسالہ ہو، جس میں اُن کی اچانک موت اور ملک سے ایک ادیب کے اٹھ جانے پر اظہارِ افسوس نہ کیا گیا ہو۔ اکثر میں ان کے اخلاق، سیرت، علمی لیاقت، ادبی قابلیت اور کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ آکا کی خانگی زندگی، مثلاً گھر میں اُن کی نشست و برخاست، میل جول، طرزِ گفتگو، چھوٹوں سے برتاؤ، بیوی بچوں کی محبت وغیرہ پر جو کچھ بھی لکھا گیا ہے وہ نہیں کے برابر ہے۔ ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب نے جو مضمون براڈکاسٹ کیا تھا، اُس میں عام حالات کے تحت کچھ تھوڑی سی جھلک خانگی زندگی کی بھی آگئی تھی، مگر پھر بھی اُن کی زندگی کی مکمل تصویر نہیں تھی۔ اس لیے میں نے خیال کیا کہ اتنے بڑے ادیب کے ایسے حالات بھی قلمبند ضرور کر دیے

ؔ حال ہی میں ایک رسالہ نے آکا کو ''چغتائی'' لکھا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ لکھنے والے صاحب کے ذرائع معلومات کیا ہیں۔ جہاں تک مجھے یقین کے ساتھ معلوم ہے، آکا کا تعلق ازبک اور برلاسی ملے ہوئے خاندانوں سے تھا۔ چغتائی خاندان سے اُن کا یا اُن کے بزرگوں کا کبھی بھی کوئی تعلق نہیں رہا۔

چاہئیں، جس میں اس قسم کی حتی الامکان سب باتیں آجائیں۔

آکا میری حقیقی پھپی کے بیٹے تھے، مجھ سے پورے آٹھ سال بڑے تھے یہ ۱۸۸۴ء کے شروع میں ڈپٹی سلطان خان کی حویلی واقع چوڑیوالان دہلی میں پیدا ہوئے۔ آکا کی عمر صرف دس روز کی تھی کہ اُن کی والدہ کا سایا اٹھ گیا۔ آکا کی ایک حقیقی پھپی تھیں، جو لاولد تھیں اور آکا کے والد میرزا حشمت اللہ بیگ سے وہ عمر میں اتنی بڑی تھیں کہ آکا کے والد کو گود لے کر پالا تھا۔ اس طرح آکا اپنی پھپی کے پوتے ہوتے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد انہی پھپی نے آکا کو ایسا پالا کہ سگی ماں بھی شاید ایسا نہ پالتی۔ پڑھایا، لکھایا، نوکری کے لیے حیدر آباد بھیجا اور ۱۹۰۸ء میں خود پورے کنبے کو ساتھ لے کر گلبرگہ شریف میں اُن کی شادی کی اور اس طرح ان کی زندگی کی ابتدائی مراحل کو پورا کر کے خود چند ہی دن کے بعد جنت کو سدھاریں، غفراللہ لہا۔ اُن کا سلوک آکا کے ساتھ یہیں ختم نہیں ہوا، بلکہ چلتے چلتے اپنی بہن اور بھائیوں کو تاکید کر گئیں کہ میرا جو کچھ ہے، وہ سب فرحت کا ہے۔ تم لوگ سب کچھ اُسی کو دے دینا۔ چنانچہ سب چچاؤں اور پھپی نے فوراً اس وصیت کی تعمیل کی اور سب نے ہبہ نامہ لکھ کر رجسٹری کرادی۔ اس طرح آکا جائداد اور گاؤں کے مالک بن بیٹھے۔ تاہم آکا کی یہ انتہائی شرافت اور فراخدلی تھی کہ جب جائداد فروخت کی تو آکا نے پھپی کا پورا حصہ اُن کی اولاد کو بلا کسی حجت اور حیلے کے ادا کر دیا۔

آکا نے دلّی کی جائداد انتقال سے تقریباً چار سال پہلے فروخت کر دی تھی۔ اس طرح انھوں نے گو اپنا پورا تعلق دہلی سے اٹھا لیا تھا، لیکن اس تعلق کے منقطع ہو جانے کا اُن کو رنج اور افسوس ضرور تھا۔ آخر آخر زمانے میں دہلی جانے کی بڑی خواہش تھی۔ انتقال سے چند روز پہلے دلّی جانے کے لیے نومبر کا مہینا مقرر کیا تھا۔ میاں نصیر نے بھی اُن سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بھی ساتھ چلیں گے مگر کیا خبر تھی کہ نومبر کا مہینا تو دور کی بات ہے، پورے پندرہ روز بھی نہ گزریں گے کہ یہ ہم سب کو داغ مفارقت دے کر اس قدر جلد چلے جائیں گے۔

دہلی میں ہمارا مکان فراش خانہ میں تھا۔ اور آکا چوڑیوالاں میں رہتے تھے۔ ہر اتوار کی صبح کو یہ اپنی نانی صاحبہ مخدومہ یعنی میری دادی صاحبہ سے ملنے آیا کرتے تھے۔ کبھی تو شام تک ٹھیرتے ورنہ عموماً گیارہ بارہ بجے واپس چلے جایا کرتے تھے۔ اسی طرح ہفتے میں بھی عشرے میں ایک آدھ مرتبہ

اُن کے ہاں چلا جاتا تھا۔ چونکہ میں دلی میں بہت کم رہتا تھا۔ اس لیے ملنا جلنا بھی کم ہوتا تھا یہی وجہ ہے کہ اُس زمانے کے حالات سے میں پوری طرح واقف نہیں ہوں۔ اس زمانے کے حالات جیسا کہ ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب لکھ سکتے ہیں اور کوئی نہیں لکھ سکتا۔ وہ دونوں ساتھ کھیلے اور ساتھ پڑھے ہوئے ہیں ۱۹۰۸ئ میں ایم۔ اے کا امتحان دے کر حیدر آباد آئے۔ جب تک ملازمت کا سلسلہ شروع نہیں ہوا، یہ ایک کتاب کا ترجمہ کرتے رہے، جو غالباً نواب سراج یار جنگ بہادر نے اُن کو ترجمے کے لیے دی تھی۔ شروع ۱۹۰۹ء میں یہ ملازم ہو کر بحیثیت مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول چادر گھاٹ میں مڈل کلاس کو پڑھانے لگے۔ میں بھی اُسی اسکول، اُسی جماعت میں، مگر دوسرے سکشن میں پڑھتا تھا۔ آکا وہاں صرف چند مہینے ہی رہے ہوں گے کہ ہائی کورٹ کی صدر مترجمی پر چلے گئے اور رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے انسپکٹنگ افسر عدالت ہو گئے تھے۔

جیسا کہ غلام یزدانی صاحب نے فرمایا، آکا میں محبت کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ اپنی پہلی بیوی سے بھی اُن کو بہت محبت تھی۔ شاید چار برس وہ زندہ رہیں۔ جب اُن کا انتقال ہوا تو آکا کو اس قدر صدمہ تھا کہ عرصے تک اُن کی یہ کیفیت رہی کہ دفتر سے آئے چائے پی اور پیدل بیوی کی قبر پر چلے جاتے تھے۔ قبرستان تین میل تھا۔ بس سمجھ لیجیے کہ روزانہ چھ میل فقط فاتحہ پڑھنے جایا کرتے تھے۔ اب بھی بڑھاپے میں کبھی اُن مرحوم بیوی کا ذکر آ جایا کرتا تو بہت دبی ہوئی آہ نکل جاتی تھی۔ یوں تو وہ سب ہی سے محبت کرتے تھے، مگر آخر زمانے میں بڑے بیٹے کی لڑکی سے بہت زیادہ محبت تھی، اُس کو اپنے ہی پاس رکھ لیا تھا اور کسی وقت جدا نہ کرتے تھے۔ شام کو جب اُس کے مدرسے سے آنے کا وقت ہوتا تو اندر سے باہر اور باہر سے اندر اکثر ٹہلتے رہتے تھے۔ خیر، یہ تو اُن کی اولاد تھی۔ دوسروں سے بھی اسی طرح محبت کرتے تھے۔ میں جب کبھی بیمار ہوتا تو روزانہ میرے پاس ایک مرتبہ تو ضرور ہی آتے، ورنہ دو دو چکر ہو جاتے تھے۔ دوسرے بھائی بہنوں سے بھی اسی طرح محبت کرتے تھے۔ اپنا کوئی سگا بھائی یا سگی بہن نہیں تھی، اس لیے چچا زاد، پھوپی زاد اور ماموں زاد بھائی بہنوں کو اپنا سگا بھائی بہن کہتے اور اُن کے دکھ درد میں حتی الامکان برابر کے شریک رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں ایک مرتبہ جب ہم چاروں بھائی بہن موجود تھے آکا بھی اپنی نانی صاحبہ کے پاس آئے ہوئے تھے، تو ہماری دادی صاحبہ نے ہم سب کو مخاطب

کر کے فرمایا تھا کہ "میری ساری اولاد میں صرف تم ہی پانچ باقی ہو، اسی لیے تم ایک دوسرے سے محبت کرنا اور دیکھو فرحت تم سب سے بڑے ہو، یہ یتیم ہیں، ان سب کو ہمیشہ اپنا سگا بھائی بہن سمجھنا" اُس دن سے مرنے تک واقعی اُنھوں نے ویسا ہی سمجھا۔

دلّی میں میری والدہ صاحبہ کے رہنے کے لیے آکا نے اپنا ایک مکان دے دیا تھا۔ میری والدہ اُس میں (۲۷) سال بڑے آرام سے رہیں اور آکا کو ہمیشہ دعائیں دیتی رہیں۔ جب کبھی آکا دہلی جاتے تو وہیں ٹھیرتے اور بڑے خوش ہوتے تھے کہ گھر تو ایسا ہے کہ جہاں میں آکر ٹھیر سکتا ہوں جب سے آکا نے وہ مکان فروخت کر دیا تھا، رہنے کو نہ تو ٹھکانا رہا تھا اور نہ گھر سے جانے کی اجازت ملتی تھی، دل مسوس کر رہ جاتے تھے۔ اس لیے اُس کے بعد دلّی جا ہی نہ سکے۔ اب جب میں نے وہاں مکان لے لیا، تو نومبر میں جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ مرنے سے شاید آٹھ دس روز پہلے خبر آئی کہ جناب زاہد حسین صاحب مسلم یونیورسٹی کے چانسلر ہو گئے۔ میرے پاس جب آئے، یہ خبر سنا کر کہنے لگے کہ جب دہلی جائیں گے، تو علی گڈھ بھی ضرور چلیں گے زاہد حسین صاحب سے اُن کو تھوڑے ہی دنوں کی ملاقات میں بیحد خلوص ہو گیا تھا، زاہد صاحب بھی آکا سے بہت خلوص رکھنے لگے تھے۔ زاہد صاحب نے پرسے کا جو خط آکا کے انتقال پر مجھے لکھا تھا، اُس سے اُن کے دلی رنج اور صدمے کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ خط کے آخر میں زاہد صاحب نے لکھا تھا کہ اب تک یہ اُمید تھی کہ فرحت جب دہلی آئیں گے، تو ملاقات کا موقع نکل آئے گا، اب یہ اُمید بھی ختم ہو گئی۔

بعض لوگ ایسے بھی تھے جو آکا کے عہدے، قابلیت اور شہرت کی وجہ سے اُن سے دل میں حسد رکھتے تھے۔ بعض ظاہر داری سے کبھی کبھی ملتے بھی تھے اور بعض ملتے بھی نہ تھے اور عجیب بات یہ ہے کہ جب تک کوئی خاص ثبوت سامنے نہ آجاتا، آکا کو اس کا یقین بھی نہیں آتا تھا، وہ کہا کرتے تھے کہ جب میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا، تو کوئی کیوں مجھ سے ناراض ہو گا۔ ان میں سے کچھ لوگوں کو میں جانتا ہوں، بلکہ ان لوگوں نے آکا کے ساتھ بعض ایسی خفیف حرکات کی تھیں جو کرنے والے صاحب کے ہرگز شایانِ شان نہ تھیں، اگر میں نام بتا دوں تو لوگ سُن کر دانتوں میں انگلیاں دے لیں گے۔ میں وہ نظر انداز کرتے ہوئے اسی طرح کا ایک اور دلچسپ واقعہ بیان کر دیتا ہوں، وہ یہ ہے، کہ آکا کے پاس ایک صاحب اختر حسین نامی کا خط بمبئی سے آیا، اُس میں

لکھا تھا کہ میں اور میری والدہ آپ کے مضامین بہت دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ چند روز پہلے ہم لوگ جب حیدر آباد آئے تھے، تو اکثر لوگوں سے آپ کا پتا پوچھا تھا، لیکن افسوس کسی کو آپ کا مکان معلوم نہ تھا، ملاقات کی حسرت لے کر ہم واپس ہو گئے، اگر کبھی آپ بمبئی تشریف لائیں، تو ہم کو ضرور اطلاع دیں، ہم لوگ آپ کی ملاقات کے بیحد مشتاق ہیں۔ اس کے بعد "مضامین فرحت" کے نئے حصے کی فرمائش لکھی تھی۔ آکا نے یہ خط مجھ کو بھی دکھایا۔ میں نے مذاق سے کہا کہ جائیے اب کیا ہے، ٹھیرنے کو عمدہ مکان، بہترین کھانے، اس سے بہتر بمبئی میں اور کیا موقع ہو سکتا ہے۔ یہ خط بمبئی کی مشہور مغنیہ جدن بائی کے صاحبزادے کا تھا۔ ایک عرصہ گزر گیا اور یہ واقعہ ہم کو یاد بھی نہ رہا۔ اتفاق سے میں اور آکا بمبئی گئے، وہاں جا کر بھی ہم دونوں کو یاد نہ آیا۔ بمبئی میں ہمارے ایک بہت قدیم ملاقاتی شہاب الدین صاحب گئے ہیں۔ یہ ہائی کورٹ بمبئی میں ملازم تھے۔ اب پنشن یافتہ ہیں۔ ایک روز ان کے بڑے صاحبزادے ابراہیم صاحب ہمارے پاس بیٹھے ہوئے تھے، ادھر اُدھر کی باتوں میں شام کی سیر کو جانے کا پروگرام بن رہا تھا۔ ابراہیم صاحب نے کہا آج آپ لوگ میرین ڈرائیو کی سیر کیجیے، میں بھی وہاں تک ساتھ چلتا ہوں، مجھے جدن بائی صاحبہ کے لڑکے سے ملنا ہے۔ یہ نام سنتے ہی مجھے اور آکا کو اُس خط کا خیال آیا، ابراہیم صاحب سے اس کا ذکر کیا گیا۔ انھوں نے اُسی وقت ٹیلیفون کر دیا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اختر صاحب موٹر لے کر آگئے، آتے ہی سر ہو گئے کہ چلیے پانچ منٹ کے لیے ہمارے ہاں تکلیف کیجیے۔ مجبوراً ہم تینوں وہاں چلے گئے۔ نہایت عمدہ بلڈنگ، سمندر کا کنارا، عمدہ ساز و سامان تھا، جدن بائی سے ملاقات ہوئی۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی، جب میں نے دیکھا کہ ماں بیٹے اس طرح آکا کی خاطرداری کر رہے تھے جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ واقعی وہ ان کی ملاقات کے عرصے سے بھوکے تھے دوسرے روز بڑے ٹھاٹھ کی دعوت ہوئی۔ باتوں باتوں میں حیدرآباد میں جن جن لوگوں سے انھوں نے پتا پوچھا تھا، اُن کے نام معلوم ہو کر بڑی حیرت ہوئی، کیونکہ ان میں سے بعض ایسے بھی نام تھے، جن سے آکا کی کبھی کوئی رنجش یا بدمزگی ہوئی ہی نہ تھی۔ جدن بائی خود کہتی تھیں کہ ہم کو خود حیرت اس بات کی تھی کہ اتنی بڑی شخصیت اور کوئی واقف نہیں ہے۔ بہرحال اس واقعہ کے بیان کرنے سے میرا مقصد یہ بتا دینا ہے کہ آکا جیسے مرنجاں مرنج انسان سے بھی کچھ لوگ

بلا وجہ حسد اور بغض رکھتے تھے۔

ہمدردی، حسن سلوک، امداد اور اعانت کا جذبہ آ کا میں بہت تھا۔ تنخواہ کا ایک حصہ انھوں نے صرف اس کے لیے مختص کر رکھا تھا۔ اکثر غریبوں اور بیواؤں کی تنخواہیں مقرر تھیں۔ تنخواہ آتے ہی پہلے اُن کا حصّہ نکال کر بڑے اہتمام سے بھیجا کرتے تھے۔ ان کے ایک مرحوم چچا صاحب کا ایک پروردہ تھا، جو نابینا ہو گیا تھا۔ اُس کو ہمیشہ اپنے پاس اس طرح رکھا کہ جب مکان بنوایا تو اُس کے لیے ایک کمرہ اور ایک وراندہ خاص طور پر تیار کرایا تھا اور اس کے رہنے، سہنے، کھانے کپڑے، کا انتظام کیا تھا کہ لوگوں کو اکثر مغالطہ ہوتا کہ یہ بھی شاید اسی خاندان کا ایک فرد ہے۔ اُس کو ظاہرا جو تنخواہ دے دیتے تھے، اُس کے علاوہ چھپا کر بھی ایک مختصر رقم اُس کو دیا کرتے تھے لیکن ہمیشہ یہ تاکید کر دیتے کہ اگر تو نے اس کا کبھی کسی سے ذکر کیا، تو اُسی روز سے یہ بند کر دونگا کسی کو تکلیف میں دیکھتے تو کوشش کرتے کہ کسی نہ کسی طرح مدد کی جائے۔ رحمت بھائی ذکر کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اور بھائی فرحت کسی صاحب سے ملنے ایک جگہ گئے۔ مغرب کی نماز کے لیے قریب کی ایک چھوٹی سی مسجد میں جہاں صرف چار پانچ ہی نمازی تھے چلے گئے۔ مسجد کے امام صاحب کی حالت بہت سقیم تھی، کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ رحمت بھائی کہتے ہیں کہ نماز کے بعد میں ایک طرف کونے میں بیٹھا وظیفہ پڑھ رہا تھا، بھائی نے نماز ختم کر کے ادھر اُدھر دیکھا کہ کوئی ان کو دیکھ تو نہیں رہا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ نکال کر چپکے سے امام صاحب کی جانماز کے نیچے رکھ کر چل دئے اور شاید دل میں انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ مجھ سمیت کسی نے اُن کو نہیں دیکھا غرض اسی طرح مجھے کبھی فکر مند دیکھتے تو چپکے سے پوچھتے کہ تجھ کو کچھ ضرورت ہے تو مجھ سے لے لے۔ کبھی مجھے قرضے کی ضرورت ہوتی اور مانگتا تو بڑے خوش ہوتے اور فوراً دے دیا کرتے تھے لیکن یہ بھی ضرور تھا کہ قرضہ وصول کرنے میں ذرا عجلت اور سختی کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ انھوں نے کسی پر تقاضا کرنے کا خیال ظاہر کیا تو میں کہتا کہ ابھی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے، اگر وعدے کے دن ہو گئے، تو ممکن ہے کہ ابھی انتظام نہ ہوا ہو، تھوڑا انتظار کیجیے۔ میرے سمجھانے سے دو چار روز ٹھیر جاتے، مگر عادت کے مطابق پھر گھبراہٹ ہوتی اور پھر اُسی فکر میں آخر تقاضا کر ہی دیتے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ آ کا کو ایسے معاملات ہوں یا دوسری قسم کے، ذرا موقع و محل کا خیال

نہیں رہتا تھا، لیکن یہ ایسی چیز نہ تھی جس سے اُن کی خوبیوں پر اثر پڑتا۔ اُن کی داد و دہش عموماً چھپی ہوئی ہوتی تھی، اس لیے نہ معلوم کس کے ساتھ کیا سلوک تھا۔

عام طور پر بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ملتے ہوئے خصوصاً سرکاری لوگوں سے آکا بہت ہچکچاتے تھے، اگر یہ اطلاع ہوتی تھی کہ باہر کوئی ملنے آیا ہے اور آنے والا کوئی دوست یا ملاقاتی بھی نہیں ہے، تب تو بہت ہی گھبراتے تھے۔ ہم لوگ کبھی اگر اتفاق سے بیٹھے ہوئے ہوتے تو مذاق کے طور پر آدمی سے پوچھا کرتے تھے کہ موٹر پر آئے ہیں، سائیکل پر آئے ہیں، یا پیدل آئے ہیں۔ بہرحال انجان آدمیوں سے تو ملتے ہوئے بہت ہی جھجکتے تھے۔

رواداری، برتاؤ اور نبھانے کے معاملے میں شاید آکا کی کوئی نظیر مل سکے۔ دنیا کا قاعدہ ہے کہ خاندان کے بزرگوں سے، یا امیروں اور بڑے عہدہ داروں سے تو ہر شخص، خواہ خوشی سے، یا دنیا دکھاوے کے لیے، اخلاق ضرور برتتا ہے، مگر آکا کا برتاؤ اپنے سے چھوٹوں کے ساتھ بھی ایسا ہوتا تھا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ خود ان سے چھوٹے ہیں۔ میرزا رحمت اللہ بیگ صاحب اُن کے سگے چچازاد بھائی ہیں۔ عمر میں اُن سے دو ڈھائی سال چھوٹے ہیں۔ یہ ہمیشہ آکا سے ہر معاملے میں جھک جھک کیا کرتے تھے۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا، جو کسی بات میں دونوں کی ایک رائے ہوتی ہو۔ میں نے ہمیشہ ان میں اختلاف ہی دیکھا۔ پھر باوجود اس کے دونوں میں بہت ہی محبّت تھی، لیکن جب دیکھو خوب گرما گرم بحث ہوتی رہتی تھی۔ میں خود بھی بعض معاملات میں اکثر اُن سے الجھ جاتا تھا، چھوٹا ہو کر بھی اختلاف کرتا تھا، مگر کیا مجال جو کبھی اُن کی تیوری پر بل پڑا ہو۔ اُس اللہ کے بندے نے کبھی یہ نہ سمجھا کہ یہ چھوٹے ہو کر ایسا کرتے ہیں۔

احمد خاں صاحب سے آکا کے بہت قدیم تعلّقات تھے، ایک مرتبہ آکا، خان صاحب! در میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے، کچھ حقوق کے متعلق گفتگو چھڑ گئی۔ نہ معلوم کب سے خان صاحب بھرے ہوئے تھے کہ ایک دم آکا پر تلہ بول دیا، کہ فرحت تم نے فلاں کی حق تلفی کی ہے، اُس کی ضرور تلافی کرو، ورنہ خدا کو کیا جواب دو گے۔ اپنی عادت کے مطابق بڑی دیر تک آکا مختلف پہلوؤں سے جواب دیتے رہے۔ آکا کی عادت تھی کہ بڑی مشکل سے قایل ہوا کرتے تھے، لیکن چوں کہ خان صاحب صحیح طور پر لڑ رہے تھے اور آکا کے پاس معقول جوابات نہ تھے، آخر خان صاحب نے دبا ہی لیا۔

آکا کی گفتگو سے یہ ضرور معلوم ہوتا تھا کہ وہ دل سے تو محسوس کرتے ہیں کہ واقعہ صحیح ہے، مگر آخر میں صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے کہ "تم سچ کہتے ہو، مگر میں ایسا کر نہیں سکتا"۔ یہ گفتگو ذرا تلخ بھی ہو گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ ہم لوگوں کی آیندہ شکل بھی دیکھنا پسند نہ کریں گے، مگر کیا مجال جو اس کے بعد ہم کو یہ بھی محسوس ہوا ہو کہ آکا نے اس کا کوئی اثر لیا ہے۔

حیدرآباد کی اعلیٰ سوسائٹی میں نشست و برخاست، بات چیت کا طریقہ، ملنا جلنا، تعظیم تکریم، غرض اس قسم کی جتنی بھی چیزیں ہیں، وہ ایک خاص معیاری ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ نہایت ہی اعلیٰ اخلاق کی حامل ہیں۔ گو میری دانست میں ان میں ظاہرداری اور بناوٹ کا عنصر حقیقت سے بہت زیادہ ہوتا ہے اور خلوص بہت کم ہوتا ہے۔ ہمارے آکا ان تمام باتوں سے بالاتر تھے۔ وہ جس سے ملتے تھے، نہایت خلوص سے اور ہمیشہ یکساں طریقے پر ملتے تھے۔ ان کی طبیعت میں نہ بناوٹ تھی اور نہ ظاہرداری، اس لیے حیدرآباد کے اخلاقی معیار کے لحاظ سے ان میں بہت سی باتوں کا فقدان تھا۔ وہ بالکل صاف اور کھلے ہوئے دل سے ملتے تھے۔ لگی لپٹی کبھی رکھنے ہی نہ تھے، جو دل میں ہوتا، پھٹ سے کہہ دیا کرتے تھے۔ موقع اور محل کی پروا نہ تھی۔ ظاہرداری یا دکھاوے کے اخلاق سے یا "آپ" اور "جناب" سے تو وہ شاید دو ایک ہی آدمیوں سے مخاطبت کرتے ہوں تو کرتے ہوں، ورنہ عام طور پر "تم" سے بات کیا کرتے تھے اور آخر زمانے میں تو جن سے ذرا دوستی زیادہ تھی، اُن سب سے "تو" سے مخاطبت کرتے تھے۔ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ بعض اوقات کچھ لوگوں کی تیوری پر ذرا بل بھی پڑ گئے ہیں۔ یہ بل عموماً اُس وقت پڑتے تھے، جب مجمع زیادہ ہوتا اور مخاطب صاحب کو اپنی اعلیٰ شخصیت اُس مجمع میں ظاہر کرنی ہوتی تھی، لیکن ہمارے آکا کو ان چیزوں کا بالکل احساس نہ تھا، ملنے والا چاہے اکیلے ہی ملے یا بھرے مجمع میں، ہر جگہ وہ ایک ہی طریقے سے ملتے تھے۔

آکا میں کچھ تھوڑی سی کمزوریاں بھی تھیں، لیکن یہ کمزوریاں ایسی نہ تھیں جس سے کسی دوسرے کو تکلیف یا رنج پہنچتا ہو، بلکہ وہ ان کی ذات تک محدود تھیں۔ پہلی کمزوری تعلّی کی تھی اپنی شاعری، اپنے مضامین، اپنی موٹر، اپنا گھر، غرض ہر اپنی چیز کی وہ اتنی تعریف کرتے تھے کہ وہ تعریف سے گزر کر مبالغے کی حد تک پہنچ جاتا تھا۔ بعض اوقات تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے

آکا کو جو چیز ملی ہے، وہ غالباً دنیا میں ایک ہی بنی ہے۔ ان کے دوست احباب اور بھائی بند چونکہ اُن کی اس طبیعت سے واقف تھے سن کر کبھی کچھ کہدیا تو کہدیا، ورنہ خاموش ہوجاتے تھے یہ نہیں معلوم کہ دوسروں پر اس کا کیا اثر ہوتا تھا۔

دوسری کمزوری اُن کی گھبراہٹ یا جلد بازی تھی۔ یہ جلد بازی سرکاری کاموں میں تو سرکار کے لیے بہت مفید تھی، کیونکہ بڑے بڑے مقدمات ایک ہی نشست میں اکثر ختم کردیا کرتے تھے، مگر بھائی بندوں کے لیے بعض اوقات ذرا تکلیف دہ ہوجاتی تھی۔ اگر کہیں سب کو ساتھ چلنا ہوتا، تو پھر کوئی کام نہیں کرنے دیتے تھے، بلکہ سانس لینا بھی مشکل ہوجاتا تھا۔ ہر دو دو منٹ کے بعد گھڑی نکال کر دیکھتے اور تقاضے پر تقاضا کرتے تھے۔ ہم میں سے کسی کو اگر دوکان سے کچھ خریدنا ہے اور یہ خالی کھڑے ہیں، تو اُس وقت دقّت ہوتی تھی۔ نہ ٹھیک طرح کچھ دیکھنے دیتے تھے اور نہ پوری بات کرنے کی مہلت ہوتی تھی۔ اس معاملے میں بھائی فصیح الدین صاحب سے اکثر جھڑپ ہوا کرتی تھی۔ فصیح بھائی کو دوکانوں میں نیا نیا سامان دیکھنے کا شوق اور آکا کی گھبراہٹ بس اُس وقت بڑا ہی لطف آتا تھا، جتنا یہ تقاضا کرتے، اتنا ہی فصیح بھائی دیر کرتے اور بڑی مشکل سے یہ مشکل آسان ہوتی۔

آکا کی یہ عادت تھی کہ جب تک اپنی بات پوری نہ ہوجاتی، حد درجہ وہ بے قرار رہتے اکثر ایسا ہوا ہے کہ ان کو کسی سے کچھ کہنا ہے یا کچھ کام ہے اور یہ بیٹھے اُس کا انتظار کررہے ہیں اب اگر وہ شخص آتا ہوا دکھائی دیا، تو ان کو اتنا صبر نہیں ہوتا تھا کہ آنے والا ان تک پہنچ جائے یا اگر تھکا ماندہ ہے تو ذرا سانس لے لے۔ یہ اپنی گھبراہٹ میں خود ہی جلدی سے اُس کے پاس پہنچ جاتے اور اگر اتفاق سے وہ آتے ہی کسی دوسرے سے باتوں میں مشغول ہوگیا، تو پھر ان کی بے چینی دیکھنے کے قابل ہوتی تھی، آخر اپنی بات جب تک اُس سے نہ کہہ دیتے اُن کو قرار نہیں آتا تھا۔ بعض اوقات ہم نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ اُن کی اس گھبراہٹ اور جلد بازی سے اُن کے کام بھی خراب ہوگئے، مگر وہ اپنی سادگی اور عادت سے مجبور تھے۔

ایک مرتبہ مجھے آکا کے ساتھ مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر کے ہاں مشاعرے میں جانے کا اتّفاق ہوا۔ مشاعرہ شروع ہوا، قاعدے کے مطابق کچھ چھوٹے شعرا کلام سناتے رہے ہیں آکا

کے بالکل بازو بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہر شاعر کے کلام سناتے ہی ان کو گھبراہٹ سی ہوتی تھی۔ ہاتھوں کی حرکت، زانووں کی تبدیلی سے اُن کا مطلب یہ ہوتا کہ اب ان سے پڑھنے کے لیے کہا جائے۔ ایک مرتبہ مہاراجہ بہادر کی بھی نظر پڑ گئی۔ انھوں نے ان کو اشارا کیا اور یہ فوراً ہی میدان میں آ گئے۔ حالانکہ میرے خیال میں اُن کی جیسی شخصیت کے لیے ابھی موزوں وقت نہ تھا، مگر طبیعت کی گھبراہٹ نے نچلا بیٹھنے نہ دیا۔

جس وقت آکا عدالتوں کے انسپکٹنگ افسر مقرر ہوئے ہیں، اُس سے کچھ دن پہلے سے ان کو دل کے دوروں کا عارضہ شروع ہو چکا تھا، لیکن یہ دورے وقفے وقفے سے پڑا کرتے تھے اس سرکاری خدمت کے لحاظ سے مہینے میں تقریباً بیس روز کا دورہ ضروری تھا۔ دل کے اس عارضے کی وجہ سے اکثر لوگ زیادہ دورہ کرنے سے منع کرتے تھے، لیکن آکا ہمیشہ یہ کہا کرتے کہ میں جب دورہ پر جاتا ہوں تو اچھا رہتا ہوں۔ تصدیق رحمت بھائی سے کراتے تھے۔ اس پر ایک بھائی نے یہاں تک کہہ دیا کہ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ تم جب گھر سے دور رہتے ہو تو اچھے رہتے ہو، آخر گھر میں ایسی کیا بات ہے، جو یہاں دورے پڑتے ہیں۔ اس کا جواب انھوں نے نہیں دیا سُن کر خاموش ہو گئے تھے۔

تیسری کمزوری اُن کی یہ تھی کہ انھوں نے گھر کی چار دیواری میں اپنی شخصیت یا رائے کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ گھر کے مالک آکا ہیں۔ کچھ لوگ اس کو کمزوری کہتے ہیں۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جو اس کو انتہائی شرافت کہتے ہیں۔ بہر حال میں اس کو کمزوری کہتا ہوں، اس سے متعلق بھی ایک بڑا دلچسپ واقعہ ہے، وہ بھی سُن لیجیے۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ آکا کی طبیعت میں جدت اور اچھوتا پن بہت تھا۔ انھوں نے جب اپنا مکان بنوایا تو اس کا نام "میرا گھر" رکھا۔ ایک پتھر پہ یہ نام لکھوا کر دروازے پر لگا دیا تھا۔ آکا کے ایک عہدہ دار دوست تھے، جن کے متعلق کہا جاتا تھا کہ اُن کو نجوم میں بہت زیادہ دخل تھا۔ جب وہ آکا کے ہاں ملنے کے لیے آئے تو شاید اُن کو یہ نام پسند نہیں آیا، یا نہ معلوم کوئی اور خاص وجہ تھی۔ ان حضرت نے یہ کہہ دیا کہ یہ نام بہت منحوس ہے۔ پھر کیا تھا آکا سے اُس کو فوراً نکال دینے کے لیے کہا گیا۔ آکا نے کہا بھی کہ نام کو نحوست سے کیا نسبت ہے،

مگر بے چارے کی ایک نہ سنی گئی! ورنہ وہ نام کا پتھر اُسی وقت نکال دیا گیا، مگر شاید اللہ میاں کو یہ باتیں بہت ناپسند ہیں۔ اسلام میں نہ کوئی دن منحوس ہے اور نہ کوئی نام، بلکہ ہر چیز کا تعلق اپنے اعمال سے ہے۔ خدا کی قدرت دیکھیے کہ اس واقعہ کے ایک مہینے کے اندر اندر خود نجومی صاحب غالباً اسی کے تصفیے کے لیے اللہ میاں کے ہاں چلے گئے۔ نام جس کے لیے منحوس ہونا چاہیے تھا، وہ تقریباً دس بارہ سال زندہ رہے۔ خود نجومی صاحب کو اللہ میاں نے اپنے پاس بلا کر اپنی شان دکھا دی۔ نہ معلوم نجومی صاحب کو کس کے ستارے دکھائی دے گئے۔ خیر، نجومی صاحب خود گئے تو گئے، ساتھ ہی آغا کے مکان کا ایک اچھوتا نام بھی ساتھ لے گئے۔

گھر میں آغا بہت ہی سیدھے سادے دیسی طریقے سے رہتے تھے۔ آرام کرسی یا صوفے وغیرہ پر اُن کو کبھی آرام نہیں ملتا تھا۔ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ جو مزا لوٹ مارنے میں ہے، وہ ان کرسیوں یا صوفوں پر بیٹھنے میں نہیں ہے۔ البتہ رات کو نواڑی پلنگ پر سویا کرتے تھے۔ دن میں بھی کبھی پلنگ پر لیٹ جاتے ورنہ زیادہ تر نیچے فرش پر یا تخت پر لیٹے رہتے تھے، اگر جاگتے ہوئے تو یا تو کوئی کتاب ہاتھ میں ہوتی تھی، یا کسی سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ میں نے خالی کبھی اُن کو نہیں دیکھا۔ دن میں سونے کو دل چاہتا تو وہیں سو بھی جاتے تھے۔

میں نے سُنا ہے کہ دنیا کی تمام قوموں میں سب سے بہتر سونے کا طریقہ چینیوں کا ہے کیونکہ وہ پاؤں سکیڑ کر اور بالکل گٹھڑی بن کر سوتے ہیں۔ آغا بھی بالکل اسی طرح سویا کرتے تھے ان کا طریقہ یہ تھا کہ کروٹ لے کر دونوں ہاتھ سر پر اس طرح رکھ لیتے کہ تمام چہرہ دونوں کہنیوں کے درمیان بالکل چھپ جاتا تھا اور دونوں پاؤں کو اتنا سکیڑتے کہ گھٹنے تقریباً پیٹ سے آن لگتے تھے۔ مطالعہ کرنے اور زمین پر سونے میں بس اتنا فرق ہوتا کہ سونے میں مُنہ دکھائی نہیں دیتا تھا اور پڑھنے میں مُنہ کے سامنے کتاب رہتی تھی۔ جب کبھی ایسے وقت ہم لوگ جایا کرتے، تو بس کتاب بند کی اور ہم سے مخاطب ہو گئے۔ ایسی صورت میں چت لیٹ جاتے ایک ٹانگ موڑ کر دوسری ٹانگ اُس کے گھٹنے پر رکھ لیتے، پیٹ پر سے کرتا اوپر کی طرف ہٹا کر پیٹ کو ایک ہاتھ سے سہلاتے جاتے اور مزے مزے کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ بعض اوقات گاؤ تکیے سے لگ کر یا آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے کسی سے باتیں کرتے تو نیم دراز ہو جاتے اور

دونوں ہاتھوں کو آپس میں جوڑ کر سر پر رکھ لیتے تھے۔

دفتر میں تو وہ میز کرسی پر بیٹھ کر لکھا پڑھا کرتے تھے، مگر گھر میں کبھی لکھنے پڑھنے کے لیے میز کرسی سے کام نہیں لیا۔ لکھنا ہوا تو اکڑوں بیٹھ گئے اور لکھنا شروع کر دیا۔ ورنا عموماً اُلٹی ٹانگ کو موڑ کر سیدھی ٹانگ کو پھیلا دیتے تھے اور گھٹنے پر پیڈ وغیرہ رکھ کر لکھنا شروع کر دیتے۔ سارے مضامین وغیرہ انھوں نے زیادہ تر اسی ترکیب سے بیٹھ کر لکھے ہیں۔ جتنے چھوٹے مضامین انھوں نے لکھے ہیں، عام طور پر وہ ایک ہی نشست میں پورا لکھ دیا کرتے تھے البتہ تاریخی یا تنقیدی مضامین میں بہت بہت دن لگ جاتے تھے۔ لکھنے کے بعد مضامین میں بہت ہی کم کاٹ چھانٹ کرتے تھے۔ نظر ثانی میں عموماً کا، کے، کی یا ایسی ہی کوئی چھوٹی موٹی اصلاحیں ہوا کرتی تھیں مضمون ختم کر کے یا تو رکھ لیتے ورنہ اگر کسی کو بھیجنا ہوا، تو اُسی وقت بھیج دیا کرتے تھے۔ لکھتے لکھتے اگر سوچنے کا موقع آتا تو ایسے وقت اُلٹے ہاتھ کی مٹھی میں اپنی ٹھوڑی کو مضبوط پکڑ کر سوچا کرتے تھے۔

میز کرسی پر کھانے میں بھی اُن کو مزا نہ آتا تھا۔ جب نیچے دسترخوان پر کھانا کھاتے تو مرنے سے چند سال پہلے تک اکڑوں بیٹھ کر کھایا کرتے تھے۔ مگر اب شاید اکڑوں بیٹھنے میں کچھ تکلف ہوتا تھا یا کیا۔ آخر آخر زمانے میں وہ سیدھی ٹانگ کو موڑ کر اور اُلٹے گھٹنے کو کھڑا کر کے کھایا کرتے تھے۔ کھانا ہمیشہ بہت تیز اور جلدی کھاتے تھے۔ ساتھ بیٹھنے والا اگر کوئی تکلف کرنے والا ہوتا تو اُس کو ان کے اس قدر جلد اُٹھ جانے پر بڑا تشویش و پیچ ہوتا تھا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد اگر خالی بیٹھنا پڑتا تو اُن کو طبیعت پر ذرا بار سا ہوتا تھا۔

ڈاڑھی ہمیشہ اپنے ہاتھ سے مونڈا کرتے تھے۔ ٹھوڑی کی بناوٹ کچھ ایسی ناہموار تھی کہ اُس میں متعدد نیچے اونچے ٹیلے اور چٹانیں تھیں۔ بڑی مشکل سے اُس جگہ کی صفائی ہوتی تھی۔ ہمیشہ کہیں نہ کہیں سے خون ضرور نکل آتا تھا۔ طبیعت میں جلدی اور گھبراہٹ اور اوپر سے ٹھوڑی کی عجیب ساخت نے اُن کو کبھی اچھی طرح ڈاڑھی بنانے نہ دیا۔

دلی جب کبھی گئے تو زنانہ اکثر ساتھ رہتا تھا، ورنہ بمبئی، کلکتہ، اورنگ آباد وغیرہ جہاں کہیں بھی جاتے تو ایسے مقامات پر زیادہ تر تو میں ساتھ رہتا تھا اور اگر میں نہ جا سکا تو

رحمت بھائی کو ساتھ لے جایا کرتے تھے، اکیلے کبھی نہیں گئے۔ اورنگ آباد کے سفر کا حال انھوں نے اپنے ایک مضمون "ایک وصیت کی تعمیل" میں لکھا ہے۔ اس مضمون میں مولانا سلیم کی گفتگو کا تذکرہ کیا ہے، "اُس وقت میں بھی اُن کے ساتھ تھا۔ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ مدراس کبھی نہیں دیکھا، چلو ایک دفعہ وہاں کا رنگ بھی دیکھ آئیں۔ لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ جب مدراس کی اردو کانفرنس کی صدارت کا بلاوا آیا تو اُس وقت میں یورپ گیا ہوا تھا۔ اس لیے رحمت بھائی کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ بمبئی عموماً میرے ہی ساتھ جایا کرتے تھے۔ انتقال سے شاید دو ڈھائی سال پہلے آخری مرتبہ جب ایک ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کے لیے جانے لگے تو مجھ سے کہا رفیق بمبئی چلتا ہے؟ میں تیار ہو گیا۔ میرا اور اُن کا ایک ساتھ یہ آخری سفر تھا۔

ایسے سفر میں جب کبھی جاتے، بالکلیہ وہ اپنے کو میرے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ مجھے رحمت بھائی کا حال تو معلوم نہیں، مگر میرے ساتھ تو اُن کی یہ حالت ہوتی کہ جیسے میرے ساتھ میرا بڑا بھائی نہیں بلکہ کوئی چھوٹا بھائی ہے اور چھوٹا بھائی بھی کیسا کہ کبھی کسی بات میں حیل حجت یا اختلاف جانتا ہی نہیں۔ میں نے اگر کہا کہ سو جائیے، تو سو جاتے۔ اگر کہا کہ کھانا کھا لیجیے، تو کھا لیتے۔ بہرحال میرے کہنے کی اس طرح تعمیل کرتے کہ مجھے خود بعض وقت اپنے الفاظ سے تکلیف ہوتی۔ مثال کے طور پر اسی آخری سفر کا ایک واقعہ لکھتا ہوں سُنیے۔ حیدرآباد سے جب ہم ریل میں سوار ہوئے تو ریل کے چلتے ہی انھوں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پوری رقم مع ریزگاری میرے حوالے کر دی۔ اس وقت مجھے پوری تعداد تو یاد نہیں، لیکن شاید سات آٹھ سو روپیے ہوں گے۔ رقم دینے کے بعد کہنے لگے، دیکھو رفیق میں تم کو ساتھ لایا ہوں۔ آنے جانے کے کرایے کا بار ہی تم پر میں نے بلاوجہ ڈالا ہے، اب سے لیکر واپسی تک جو کچھ بھی خرچ ہوگا، وہ سب میرے حساب میں ہونا چاہیے۔ میں نے بہت کچھ کہا بھی، مگر وہ کیا ماننے والے تھے۔ خیر بمبئی گئے، شاید پانچ چھ روز وہاں ایک ہوٹل میں ٹھہرے، ڈاکٹر کو دکھایا۔ اُن کو زیادہ چلنے پھرنے کی ممانعت تھی، اس لیے یہ زیادہ تر ہوٹل میں ہی رہتے تھے۔ میں اکثر کام کاج کے لیے باہر چلا جاتا تھا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ میرے جانے کے بعد وہ بھی کبھی کبھی ہوٹل سے نکل کر کہیں پھرنے چلے جاتے تھے۔ غنیمت یہ تھا کہ ہوٹل میں لفٹ تھا۔ اس لیے اوپر آنے جانے میں کوئی تکلیف

نہیں تھی۔ ایک مرتبہ میں پھر پھرا کر جو واپس آیا تو مجھ سے کہنے لگے۔ رفیق، ہم کبھی کبھی ٹہلنے چلے جاتے ہیں، شاید کسی وقت ہم کو گاڑی وغیرہ کے کرایے کی ضرورت پڑے، ہم کو ایک روپیہ دے دو۔ آپ خیال کر سکتے ہیں کہ اُس وقت میری کیا حالت ہوئی ہوگی۔ انہی کا روپیہ، پھر روپیہ بھی کافی سے زیادہ، چھوٹے بھائی سے ایک روپیہ مانگنا، یہ سب باتیں مل کر میں کیا بتاؤں میرے دل پر کتنی اثر انداز ہوئی ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جس دن سے اُن کا انتقال ہوا ہے، منجملہ اُن کی اور باتوں کے مجھے اُن کا وہ ایک روپیہ مانگنا ضرور یاد آجاتا ہے۔ یہ محض اُن کا خلوص اور سادگی تھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے کافی آکا کی خانگی زندگی پر لکھ دیا ہے، اس کے پڑھنے کے بعد آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ ان میں سے اگر تمام نہیں تو کم از کم ان کا بڑا حصہ ایسے واقعات اور حالات کا ہے، جو آپ نے دوسری جگہ نہ پڑھے ہوں گے۔ آخر میں ایک سب سے ضروری چیز یہ رہ گئی ہے کہ آکا ادبی دنیا میں سب کے سامنے کب اور کس طرح آئے۔ اصل پوچھیے تو اس میں بہت کچھ کوشش اور حصہ میرا ہی تھا۔ اس لیے اس کے متعلق بھی جتنے صحیح حالات میں لکھ سکتا ہوں، دوسرے کو معلوم نہیں ہیں۔

اکثر حالات میں یہ تو آپ پڑھ چکے ہوں گے کہ آکا کے مضامین پہلے پہل رسالہ "نمایش" میں چھپا کرتے تھے۔ "مضامین فرحت" کے پڑھنے والوں کو اکثر مضامین کے شروع میں "ایڈیٹر" کے نام خطوط بھی ملے ہوں گے۔ وہ "ایڈیٹر" میں ہی ہوں اور میرے ہی رسالے کا نام "نمایش" تھا، اس کی ابتدا کیونکر ہوئی، وہ بھی سُن لیجیے۔

اس مضمون کے ناظرین میں سے غالباً بہت سے ایسے ہوں گے جو عظمت اللہ خاں مرحوم سے نہ صرف واقف ہوں گے بلکہ اُن کی ادبی خدمات کے بھی مدّاح ہوں گے جس طرح انھوں نے آکا کو ادبی دنیا میں لا کھڑا کیا، وہ اردو پر ایک احسان سے کم نہیں ہے۔ اس کو آکا نے اپنی جلد اوّل کے آخر میں بیان کیا ہے۔ وہ الفاظ پڑھیے تو خان صاحب کی شخصیت معلوم ہو جاتی ہے۔ اب حقیقت سنیے ایک دن خان صاحب کہنے لگے۔ بھائی رفیق، تم بھی ایک رسالہ نکالو اور چونکہ تم تجارت پیشہ ہو، اس لیے صنعت و حرفت کا رسالہ نکالو۔ میں نے کہا، خان صاحب

مجھ کو دیکھیے اور ایک رسالے کی ایڈیٹری کو دیکھیے، بھلا یہ بیل کیونکر منڈھے چڑھے گی اور میں کیسے سنبھال سکوں گا۔ کہنے لگے تم گھبراتے کیوں ہو، آخر میں بھی تو موجود ہوں، میں مدد کیا کروں گا۔ بہرحال انھوں نے اتنا مجبور کیا کہ آخر میں نے ایک رسالہ نکال ہی دیا۔ اور وہ خان صاحب کے انتقال کے بعد بھی چھ سات سال تک چلتا رہا۔ مگر میرے یورپ جانے کی وجہ سے اُس بے چارے کا خاتمہ ہو گیا۔ رسالے کے نام کا جب سوال آیا تو میں نے آغا سے بھی پوچھا کہ میں ایک صنعتی رسالہ نکال رہا ہوں، کیا نام رکھنا چاہیے۔ چھوٹتے ہی بولے "نمائش" نام رکھو۔ چنانچہ اسی نام سے یہ رسالہ ۱۹۳۱ء میں شروع ہوا۔

جب میں نے رسالہ نکالنا شروع کیا ہے، اُس وقت تک آغا نے صرف ایک ہی مضمون لکھا تھا۔ وہ مضمون "ہم اور ہمارا امتحان" تھا۔ یہ مضمون ۱۹۱۹ء یا ۱۹۲۰ء میں رسالہ "افادہ" میں چھپا تھا، جو میرزا نظام شاہ صاحب لبیب کی زیرِ ادارت حیدرآباد سے نکلتا تھا، مگر اُس میں مضمون کے لکھنے والے کا نام فرحت اللہ بیگ نہیں تھا، بلکہ ایک اور نام سے چھپا تھا۔ اس طرح آغا نے مضمون ضرور لکھا تھا، مگر اپنا نام ظاہر نہیں کیا تھا۔

ہندوستان میں عموماً اور حیدرآباد میں خصوصاً ایک رسالے کے ایڈیٹر کے تین بڑے سخت فرائض ہوتے ہیں۔ خریداروں کی تلاش، مضمون نگاروں کی خوشامد اور کاتبوں کے گھر کے چکّر۔ رسالہ نکالنے کے بعد میں بھی اسی چکّر میں آ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ آغا ایک مضمون لکھ چکے ہیں، مجھے اُن کا یہ مضمون اُس وقت بھی پسند تھا اور اب بھی ہے۔ اس مضمون کے دیکھنے کے بعد میں جانتا تھا کہ آغا لکھ سکتے ہیں اور قلم میں بہت زور ہے، مگر آغا اپنے نام سے لکھتے ہوئے بہت گھبراتے تھے۔ میرے سخت اصرار پر انھوں نے دو ایک مضمون رسالہ "نمائش" کے واسطے لکھے، مگر اُن کو بھی اپنے نام سے چھاپنے کی اجازت نہیں دی۔ ایک دن میں نے عظمت اللہ خان صاحب سے آغا کا ذکر کیا اور اُن کے مضامین دکھائے اور کہا کہ کوئی صورت ایسی ہونی چاہیے کہ آغا سے خود اُن کے نام سے مضامین لکھوائے جائیں۔ خان صاحب بھی مضامین دیکھنے کے بعد سمجھ گئے تھے کہ لکھنے والے میں کیا کیا جواہر پوشیدہ ہیں۔ اس زمانے میں ہم دونوں مضمون نگاروں کی تلاش میں تھے۔ آپ یہ تو سمجھ گئے ہوں گے کہ اُس وقت کی میری کوشش محض اپنی غرض کے تحت تھی۔

حاشا وکلا اُس وقت میرے سان وگمان میں بھی نہ تھا کہ آج جس کے لیے ہم کوشش کر رہے ہیں، وہ آگے چل کر ہندوستان کا ایک مایۂ ناز ادیب ہوگا۔ میری ذاتی کوششیں سب بیکار ہو چکی تھیں خان صاحب کو تیار کیا۔ انھوں نے کہا کہ چلو ہم بھی چل کر کوشش کریں۔ خان صاحب کی آغا سے اُس وقت تک بہت سرسری ملاقات تھی۔ کبھی کسی تقریب میں مل لیے تو مل لیے، گھروں پر آنا جانا نہیں تھا۔ اُس زمانے میں آغا ملک پیٹھ میں رہا کرتے تھے۔ ایک دن شام میں خان صاحب کو فرصت تھی۔ مجھ کو کہلا بھیجا کہ اپنی موٹر سائیکل لے کر آؤ، آج آغا کے پاس چلیں گے۔ چنانچہ ہم دونوں آغا کے پاس پہنچے۔ خان صاحب نے اُن کے مضامین کی تعریف کی اور کہا کہ آپ ضرور لکھا کیجیے اور اپنے نام سے لکھیے۔ اوّل اوّل تو آغا نے ٹال دینے کی کوشش کی، مگر جب خان صاحب کا اصرار بہت بڑھا تو بڑی مشکل سے اس شرط پر راضی ہوئے کہ ایک خاص نام سے لکھا کروں گا۔ خان صاحب نے یہ شرط اُس وقت مصلحتاً منظور کرلی۔ اس کے بعد ہم کئی روز تک انتظار کرتے رہے مگر انھوں نے کچھ نہ لکھا۔ آخر خان صاحب نے کہا کہ چلو پھر ایک دفعہ چل کر کوشش کریں گے۔ خان صاحب کا خیال تھا کہ آغا کو اپنے نام سے لکھنے میں کچھ جھجک ہے، وہ اگر ایک دفعہ نکل جائے، تو پھر گاڑی چلنے لگے گی۔ بہرحال خان صاحب نے تین چار چکر اور کیے۔ ہمیشہ تقاضے میں شدت ہوتی گئی اور بڑی مشکل سے آخر رام کر ہی لیا۔ ایک روز صبح کے وقت میں اور خان صاحب بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ باہر ایک گاڑی آکر رکی اور آغا جلدی جلدی اندر آئے۔ ہاتھ میں کچھ کاغذ تھے۔ خان صاحب نے کہا، آغا آج تو کچھ ضرور لائے ہو۔ آغا نے کہا، خان صاحب ہم نے اپنا ایک نام تجویز کیا ہے میرزا الم نشرح، کیوں کیسا ہے۔ خان صاحب نے آغا کی جدت کی بہت تعریف کی۔ آغا نے ایک مضمون دیا اور کہا، بس اسی نام سے ہمارے مضامین چھپا کریں گے۔ چنانچہ اسی نام سے ایک عرصے تک اُن کے مضامین میرے رسالے میں چھپتے رہے۔ خان صاحب کی آغا سے جب کبھی ملاقات ہوتی، گزشتہ مضامین کی تعریف کے ساتھ خان صاحب یہ بھی ضرور کہا کرتے کہ آغا کوئی زوردار ادبی مضمون بھی لکھ ڈالیے۔ آغا ہمیشہ ہاں ہاں کرتے اور خاموش ہو جاتے۔

ایک روز شام میں میرے پاس خان صاحب کا آدمی آیا (میرا مکان خان صاحب کے مکان سے صرف ایک فرلانگ پر تھا) اور کہا کہ بلا رہے ہیں۔ میں جب پہنچا، تو دیکھا کہ آغا کچھ لکھ کر

لائے ہیں اور سنا رہے ہیں۔ میرے جاتے ہی خان صاحب نے کہا۔ آکا (خان صاحب بھی آکا کو شاید میری وجہ سے آکا ہی کہا کرتے تھے) پھر شروع سے سنائیے۔ آکا کا یہ مضمون وہی شاہکار مضمون تھا، جو ڈاکٹر نذیر احمد پر لکھا تھا۔ آکا پڑھتے جا رہے تھے اور خان صاحب ایک ایک فقرے کی اس قدر تعریف کرتے جا رہے تھے کہ بیان سے باہر ہے۔ اُس وقت تک اس مضمون کا عنوان صرف "ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی" تھا۔ خان صاحب جب مضمون سُن چکے تو پہلے مضمون پر انھوں نے قبضہ کیا پھر کہنے لگے۔ "آکا یہ مضمون نمائش میں نہیں چھپے گا، بلکہ یہ رسالہ اردو میں چھپے گا اور فرحت اللہ بیگ کے نام سے چھپے گا۔" آکا نے کہا نہیں بھئی۔ قصّہ جس طرح چل رہا ہے، چلنے دو۔ مگر اب خان صاحب بھلا اُن کے قبضے میں کب آنے والے تھے۔ انھوں نے پھر وہی رسالہ اردو میں ہی چھپنے پر اصرار کیا۔ یہ بحث بہت دیر تک ہوتی رہی جب خان صاحب نے قطعی فیصلہ کر دیا اور آکا نے بھی دیکھا کہ اب کوئی صورت بچنے کی نہیں ہے تو خود ہی بیٹھے بیٹھے کہنے لگے۔ اچھا تو اس کا نام "ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی، کچھ میری اور کچھ اُن کی زبانی" رکھ دو۔ یہ نام سُن کر خان صاحب پھڑک گئے اور فوراً یہ مضمون مولوی عبدالحق صاحب کو بھیج دیا گیا۔

اس مضمون کے شایع ہونے پر سب سے پہلے شخص نواب مسعود جنگ بہادر مرحوم تھے۔ جنھوں نے اس قدر تعریف اور اُس کا چرچا کیا کہ ہر شخص اُس کو دیکھنے کا متمنّی ہوگیا۔ درحقیقت نواب مسعود جنگ بہادر نے آکا کو ایک دم کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ ان کی تعریف کی بنا پر سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ مرحوم نے آکا کو بلایا، مضمون سُنا اور بہت تعریف کی۔ اس کے بعد آکا جہاں اور جس سوسائٹی میں جاتے، اپنی تعریفیں سُن سُن کر پھولے نہ سماتے تھے۔ اب کیا تھا، آکا کا دل بھی کھل گیا اور وہ خم ٹھونک کر میدان میں ایسے اُترے کہ ہندوستان کو اپنا گرویدہ کر لیا۔ اس کے بعد بھلا رسالہ نمائش کو کون پوچھتا۔ اب آکا آسمان پر اُڑ رہے تھے اور ہم بیٹھے دیکھا کرتے تھے۔ بلکہ پھر تو یہ نوبت آگئی تھی کہ آکا کے مضامین رسالہ نمائش میں چھپنے کے یہ معنی ہوتے کہ اُن کے مضامین کی توہین کی جا رہی ہے۔ پہلے تو یہ حالت کہ آکا جو کچھ لکھا کرتے تو مجھے سُناتے تھے، لیکن آکا اتنے اونچے پہنچ گئے تو بھلا ہم کس گنتی میں آتے۔ پھر تو

بڑے بڑے مضامین پہلے ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب کو سناتے اُس کے بعد دوسروں کی باری آتی تھی۔

اس کے کچھ عرصہ بعد آکا نے شاعری بھی باقاعدہ شروع کردی۔ یہ سچ ہے کہ آکا شروع سے ہی موزوں طبیعت لے کر آئے تھے۔ مضامین لکھنے سے بھی بہت پہلے مذاق مذاق میں کبھی کبھی کچھ اشعار موزوں کرلیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ہم سب بھائی بندر رحمت بھائی کی شادی میں جارہے تھے، ریل میں بیٹھے بیٹھے آکا نے کئی سہرے کہہ دیے۔ اُس وقت معنی یا مطالب سے تو کچھ بحث تھی نہیں، محض مذاق تھا اور دولہا سے مذاق کرنا تھا۔ بہت پُرلطف سہرے تھے۔ اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ آکا کی طبیعت میں شاعری کا مادّہ پہلے سے موجود تھا۔ فقط چھیڑنے کی ضرورت تھی اور جب مولوی سلیم صاحب مرحوم نے اس کو چھیڑ دیا، تو پھر کیا کہنا ہے۔ بہت اچھے نہ سہی تو اچھوں سے کم بھی نہ تھے۔ اُس وقت کے اشعار میں سے دو شعر میاں نصیر احمد بیگ کو یاد رہ گئے ہیں، یہاں لکھتا ہوں، آپ بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔

شاداب ہے سہرے سے سبز اترے چہرے کا ہے اوکھلا[٭] رُخ پر دریائے جمن سہرا
اس سانولی صورت پر ہے خوب پھبن اس کی باندھے ہوئے بیٹھا ہے گویا کہ کشن[٭٭] سہرا

یہ میں نہیں کہتا کہ آکا کی شاعری خراب یا کمزور تھی۔ میں جب شاعری کے حُسن و قبح کو ہی نہیں سمجھتا، تو بھلا اُس کے نکات وغیرہ کو کیا جانوں۔ البتہ مجھے اُن کی شاعری سے اختلاف اس وجہ سے ضرور تھا کہ اُن کی شاعری میں مجھے وہ زور نہیں دکھائی دیتا تھا، جو اُن کی نثر میں تھا۔ میری یہ مخالفت محض اس لیے تھی کہ شاعری کے چکّر میں پڑ کر آکا کہیں نثر لکھنا نہ چھوڑ دیں اور ہُوا بھی یہی۔ چنانچہ کئی سال تک نثر کی طرف سے اُن کی توجہ ہٹ گئی تھی۔ اُس زمانے میں اُنھوں نے بہت کم مضامین لکھے۔ میری دلی خواہش یہ تھی کہ جو مقام اُنھوں نے نثر میں

٭ اوکھلا دہلی سے سات میل پر واقع ہے، جہاں دریائے جمنا کو روک کر نہر نکالی گئی ہے۔ بہت خوبصورت چمن بندی کرکے تفریح کے لیے اچھی جگہ بنائی گئی ہے۔

٭٭ کشن دولہا کے ایک دوست کا نام تھا، جو بہت ہی کالے تھے۔

حاصل کرلیا ہے، شاعری کے چکّر میں پڑ کر وہ چلا نہ جائے۔ مجھے اکثر اپنا کلام سناتے اور میں بھی اپنی سمجھ کے مطابق تعریف بھی کر دیتا تھا، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کرتا کہ خدا کے لیے اس شاعری کی مصیبت کو چھوڑیے اور اپنی نثر نگاری چلنے دیجیے۔ آکا نے کچھ عرصے بعد اپنے منتخب کلام کا ایک مجموعہ "میری شاعری" کے نام سے ایک چھوٹی سی کتاب کی شکل میں شایع کیا تھا۔ اُس میں ان کی جدّتِ طبع دکھائی دیتی ہے۔ نظم کے ساتھ نثر بھی جوڑ دی ہے، جس کی وجہ سے وہ ایک دلچسپ چیز ہوگئی ہے۔ چنانچہ اس نثر کی وجہ سے تمام مجموعہ بغیر ختم کیے چھوڑا نہیں جاتا، ورنہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ نظم یا غزلوں کی کتابیں اس طرح پڑھی جاتی ہیں کہ کہیں کہیں سے کچھ پڑھ لیا۔ آکا نے اس کتاب کے آخری صفحہ پر میری مخالفت کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے، اُس کی نقل یہاں دیتا ہوں۔

"میرے ایک ماموں زاد بھائی میرزا رفیق بیگ ہیں۔ مجھ سے بہت چھوٹے ہیں وہ میری شاعری سے سخت نفرت کرتے ہیں، اور خفا بھی ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں "آکا" تمھاری شاعری نے تمھاری نثر نگاری کو بھی تباہ کر دیا۔ مضمون لکھتے تو کوئی پڑھتا بھی۔ اب یہ تمھارے شعر آخر کس مرض کی دوا ہیں۔ انہی حضرت نے اس مضمون کی تاریخ کہی ہے "آکا کی زبردستی کی شاعری"۔ اس سے بہتر نہ تو اس مضمون کی تاریخ ہو سکتی ہے اور نہ اس سے بہتر ریویو۔ واقعی اگر کسی نے میرے دل کی بات کہی ہے، تو انھوں نے کہی ہے۔ خدا ان کو خوش رکھے اور مجھے اس شاعری کی مصیبت سے نجات دے۔"

میں نہیں کہہ سکتا کہ ناظرین کو اس کا علم ہے یا نہیں، کہ آکا نے سینما کے لیے بھی کہانی لکھنے کی ایک مرتبہ کوشش کی تھی۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے اپنے کسی مضمون میں اس کا تھوڑا سا ذکر کیا ہے۔ لیکن اُس کے دلچسپ قصّے سے میرے سوا اور کوئی واقف نہیں ہے۔ لیکن برا ہو، اُس وقت کی خراب فضا کا اور نا اہل ہاتھوں میں سینما انڈسٹری کے ہونے کا، کہ آکا کا یہ جذبہ اُس ایک ہی واقعہ کے بعد وہیں کا وہیں ختم ہو کر رہ گیا۔ اُس کے بعد آکا اکثر کہا کرتے تھے کہ جب تک یہ انڈسٹری سمجھ دار اور قابل لوگوں کے ہاتھوں میں نہ آئیگی، اُس وقت تک اس میں ترقی نہیں

ہو سکتی۔ اس واقعہ کی کیفیت بھی چونکہ ذرا دلچسپ ہے اس لیے وہ بھی سُن لیجیے۔

آکا نے ایک کہانی لکھی تھی، اُس سے اُن کا مقصد یہ تھا کہ تاریخ میں واقعات کے ردّ و بدل سے اصلیت کو چھپا کر جو خاص غرض حاصل کی گئی ہے، یعنی ہندو مسلمانوں میں نفاق اُس کی سینما کے ذریعے اس طرح تصحیح کی جائے کہ سچے واقعات بھی آجائیں اور یہ منافرت بھی حتی المقدور دور ہو جائے۔ اُس زمانے میں آکا گلبرگہ شریف میں تھے۔ اعلیٰ حضرت کی جوبلی کے سلسلے میں بمبئی ٹاکیز کے کچھ لوگ وہاں بھی گئے تھے۔ اس کمپنی کے کہانی لکھنے والے صاحب کا نام شاید مکرجی یا بنرجی تھا، وہاں آکا سے ملے تھے۔ آکا نے اپنی کہانی کا خلاصا اُن کو سنایا تھا۔ وہ ایک بہت سمجھ دار اور قابل آدمی تھے، کوئی بیس برس یورپ میں بھی رہ چکے تھے۔ انھوں نے کہانی کو بہت پسند کیا اور کہا کہ کبھی بمبئی آنا ہو تو ہماری کمپنی میں ضرور آئیے گا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے ایسی عمدہ کہانی بہت کم پردے پر دیکھی ہے، ہماری کمپنی اس کو ضرور لے گی۔ اور آپ ہندوستان پر بڑا احسان کریں گے۔ شاید ایک یا دو سال بعد آکا کو موٹر خریدنے کی ضرورت ہوئی۔ مجھے ساتھ لیا اور ہم بمبئی گئے۔ وہاں جا کر ان صاحب کو بھی اپنے آنے کی اطلاع دیدی انھوں نے دن تاریخ مقرر کر کے کہا کہ کمپنی کی موٹر آپ کے پاس آئے گی، آپ ضرور تشریف لائیں۔ وقت مقررہ پر ہم دونوں اور ہمارے قدیم دوست مسٹر شہاب الدین گئے کمپنی کے اسٹوڈیو ملاد گئے۔ بمبئی سے یہ مقام شاید کوئی بیس ایک میل ہوگا۔ وہاں پہنچنے پر سب سے پہلے ہماری ملاقات رائے صاحب چنی لال صاحب سے ہوئی۔ رائے صاحب نے ہماری بڑی خاطرداری کی۔ تمام اسٹوڈیو کی خوب سیر کرائی، عمدہ لنچ دیا۔ اس کے بعد ہم کو پروڈیوسر یعنی ہمنسو رائے صاحب سے ملایا گیا۔ ان سے گفتگو انگریزی میں ہوتی رہی۔ آکا نے اپنا مقصد بیان کر کے کہانی کا خلاصا بتایا۔ خلاصا سننے کے بعد ہمنسو رائے صاحب نے کہا کہ آج کل فرقہ داری اختلاف بہت ہے۔ فلم میں جب دو فریقوں کو ایک جگہ جمع کیا جاتا ہے تو لوگ پسند نہیں کرتے اس لیے آپ دونوں میں سے کسی ایک ہی فرقے کو کہانی میں رکھ دیں۔ ہم کو تاریخ کی درستی یا اتحاد پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ہم کو تو پیسہ کمانا ہے۔ کسی فرقے کی طرف سے پتھر کھانے نہیں ہیں۔ اس لیے اگر ایک فرقہ ہو جائے تو میں آپ کی کہانی بڑی خوشی اور شکریے کے ساتھ

لوں گا اور آپ کو بھی کافی معاوضہ مل جائے گا۔ معاوضے کے نام سے آغا کو بھی ذرا سا تاؤ آگیا انھوں نے کہا کہ میں نے یہ کہانی روپیہ کمانے یا شہرت حاصل کرنے کے لیے نہیں لکھی۔ بلکہ اس سے میرا ایک خاص مقصد ہے اور وہ اُس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا، جب تک کہ دونوں فرقے ایک جگہ نہ ہوں۔ آپ کے طریقے سے میرا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اس پر ہمنسورائے صاحب نے کہا۔ میں نے آپ کی بہت تعریف اور شہرت سنی ہے کہ آپ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ اس لیے کہانی کا کچھ حصہ سنائیے۔ میں اب تک خاموش بیٹھا ہوا تھا، یہ باتیں سن کر میرا پارا بھی چڑھ چکا تھا۔ کیونکہ اُن کی ذہنیت سے مجھے نفرت ہو گئی تھی۔ جب انھوں نے کہانی سنانے کی فرمائش کی تو میں نے اُن سے پوچھا، کیا آپ اردو جانتے ہیں۔ کہنے لگے، تھوڑی سمجھ لیتا ہوں۔ میں نے کہا کہ جب آپ اردو نہیں جانتے تو فرحت اللہ بیگ کی اردو کی خوبی یا برائی کو آپ کیا سمجھ سکتے ہیں، اس لیے بہتر ہوگا کہ آپ ہم کو اجازت دیں اور بغیر اُن کا جواب لیے میں کھڑا ہو گیا۔ آغا بھی کھڑے ہو گئے۔ ہاتھ ملا کر دعوت اور اسٹوڈیو دکھانے کا شکریہ ادا کیا اور موٹر میں بیٹھ کر بنرجی صاحب کے پاس چلے گئے۔ وہ ہمارا چائے پر انتظار ہی کر رہے تھے۔ اُن سے سب واقعہ بیان کیا۔ اُن کو بہت افسوس ہوا۔ اُن کی بیوی یورپین تھیں، وہ بھی سُن کر برا بھلا کہتی رہیں۔ بنرجی صاحب اور جب اُن کی بیوی نے جب کہانی سنانے کی خواہش اور اُس کا جواب سُنا، وہ بہت ہنسے۔ آخر اس طرح آغا کا سینما کی کہانی لکھنے کا معاملہ یہاں تک پہنچ کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

مضمون بہت بڑا ہو گیا۔ ابھی بیسیوں باتیں رہ گئیں، اس کے لیے تو پوری ایک ضخیم کتاب درکار ہو گی۔ بہرحال اس طرح آغا دنیا میں پیدا ہوئے، رہے، سہے، بال بچے ہوئے لکھا پڑھا اور رار دد دنیا میں اپنا نام چھوڑ گئے۔ میرے حساب سے تقریباً (۲۵) سال اُن کے اس طرح ادبی خدمات میں گزرے۔ اسی مدت میں یہ سب کچھ لکھا۔ بہت زیادہ حصہ چھپ کر دنیا کے سامنے آچکا ہے، کچھ ایسا بھی ہے، جو لکھا تو ہے مگر چھپوانے کا ارادہ نہیں تھا اور میرے خیال میں اُس کو نہ چھپوانا ہی اچھا ہے۔ یہ مضامین اکثر لوگوں کو پڑھنے کے لیے دے دیا کرتے تھے۔ یہ تھے میرے آغا۔ ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ تقریباً (۶۴) سال کی عمر پائی اور دل کے

اور اس طرح آسمان ادب کا ایک عارضے سے یکایک ۲۷ اپریل ۱۹۴۷ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اس طرح آسمان ادب کا ایک چمکتا دمکتا ستارہ غروب ہوگیا۔ ہم خاندان کے لوگوں سے ایک سچی ہمدردی رکھنے والا اور محبت کرنے والا، بلکہ خاندان کا ایک فخر رکن ہم سب کو داغ فراق دے کر چل دیا۔ اُسی روز شام کے وقت ٹھگی جیل کی مسجد کے قبرستان میں اپنے والد صاحب کے پائنتی دفن ہوئے۔ اللہ تعالیٰ اُن پر اپنی رحمت کی ہمیشہ بارش فرماتا رہے۔ آمین۔

آکا کی شادی مرزا ساجد بیگ صاحب کی بڑی صاحبزادی سے پہلے ہوئی تھی۔ لیکن یہ بیوی چار سال بعد ہی ایک لڑکا چھوڑ کر انتقال کر گئیں۔ اس کے بعد انہی کی منجھلی بہن سے آکا کی شادی ہوئی۔ بفضلہ یہ اب تک موجود ہیں۔ آکا نے دو لڑکے اور پانچ لڑکیاں چھوڑی ہیں۔ بڑے لڑکے میرزا شرافت اللہ بیگ دوم تعلقدار ہیں، یہ پہلی بیوی کے بطن سے ہیں۔ دوسرے لڑکے میرزا رفعت اللہ بیگ سول سرجن ہیں۔ بڑی صاحبزادی میجر معین الدین سے۔ منجھلی سید حمید الدین رضوی مہتمم آبکاری سے۔ اور سنجھلی لڑکی میرزا مودود احمد خاں مددگار ناظمِ جنگلات سے بیاہی گئی ہیں۔ دو لڑکیوں کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی کہ خود ہی رخصت ہو گئے۔

میرزا رفیق بیگ

نوٹ:۔ ان دونوں بیٹیوں کی بھی شادی ہوگئی ہے۔ دونوں میں سے بڑی صاحبزادی اشرف جہاں کی احمد اللہ سے جو نواب صدیق یار جنگ مرحوم کے بیٹے ہیں اور لیبر کے محکمے میں مددگار ہیں۔ چھوٹی لڑکی مسعود جہاں کا بیاہ ہاشم علی خاں سے ہوا ہے جو نواب محمد نواز جنگ مرحوم کے صاحبزادے ہیں اور دوم تعلقداری کے عہدے پر فائز ہیں (ایڈیٹر)

ایک بھائی کی یاد

میرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم میرے یک جدی بھائی تھے اور میری حقیقی چچازاد بہن بھی ان کو بیاہی گئی تھیں۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم بھی پائی۔ ۱۹۰۸ء کے اخیر میں ملازمت کی خاطر حیدر آباد آئے اور یہیں کے ہو رہے، البتہ کبھی کبھی دہلی جایا کرتے تھے۔

میں حیدر آباد میں پیدا ہوا۔ دسمبر ۱۹۰۶ء میں تعلیم کی غرض سے علی گڑھ گیا۔ نویں جماعت میں داخلہ ملا۔ کرسمس کی تعطیلات میں خیال ہوا کہ چلو دتی چلیں، آبائی وطن کو دیکھیں، اور اُن رشتے داروں سے ملیں جن کا تذکرہ اپنے بزرگوں سے سنتے رہتے ہیں، لیکن کبھی صورت نہیں دیکھی۔

برادر مرحوم سے ملاقات کا یہ پہلا موقع تھا۔ وہ بی۔ اے پاس کر کے تعلیم کے جھگڑے سے آزاد ہو چکے تھے۔ بڑی محبت سے ملے، دتی کی خوب سیر کرائی، تمام اخراجات اپنی جیب سے دیے۔ میں ہر چند روکتا تھا، مگر وہ یہی جواب دیتے تھے کہ تم مہمان ہو، ہمارا فرض ہے کہ تم کو سیر کرائیں۔ بھائی صاحب کی محبت اور مہمان نوازی کا مجھ پر گہرا اثر ہوا۔ اکثر تعطیلات میں دتی چلا جایا کرتا تھا۔ ہر دفعہ وہی خلوص اور مہمان نوازی دیکھی، جو ایک شریف انسان کی طبیعت کا تقاضا ہے۔

جب وہ حیدر آباد میں مستقل طور پر رہنے لگے تو ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ رفتہ رفتہ تعلقات اور یکجہتی ایسی ہو گئی کہ بعض لوگ ان کو برادرِ حقیقی سمجھنے لگے۔ آخری دم تک یہی تعلقات قائم رہے۔ کبھی کوئی وجہ رنجش یا شکایت کی پیدا نہیں ہوئی۔ اس کا بڑا سبب خود مرحوم کا نیک کردار تھا۔ مرنج اور مرنجاں پالیسی رکھتے تھے۔ دوسروں کے معاملات میں دخیل نہیں اور اپنی طرف سے کسی کو رنج نہ پہنچے، یہ تھا خلاصا ان کی زندگی کا۔ کہا کرتے

تھے، میں اوّل تو کسی سے لڑتا نہیں اور مجبوراً کسی سے لڑائی ہو جائے تو پھر ملتا نہیں۔

خصوصیاتِ طبعی ممتاز اور نمایاں تھیں تفصیل کے لیے مستقل سوانح عمری کی ضرورت ہے۔ مختصر یہ کہ سیر چشم، کنبہ پرور، نیک نیّت، ہمدرد اور صداقت پسند بہ درجۂ اولیٰ تھے معاملے کے اس قدر کھرے کہ کسی کا قرضہ رکھنا سخت ناگوار تھا۔ دوکان داروں سے کھاتا ضرور تھا، لیکن پہلی تاریخ تنخواہ ملتے ہی حساب چکتا کرنے نکلتے تھے۔ اگر کسی دوکان دار نے کہا کہ ابھی آپ کا حساب تیار نہیں ہوا ہے تو اصرار کر کے بل بنواتے، جب تک پوری ادائی نہ ہو جاتی ان کو چین نہ پڑتا۔ اس وضعداری کو کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اگر کسی سے قرض وصول کرنا ہوتا تو تقاضا بھی شدّت سے کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوا کہ مجھ سے تقاضا کر کے (۲ر) جزئی رقوم بھی وصول کر لیے۔ اس کی وجہ ان کی تنگ دلی نہ تھی بلکہ معاملے کی صفائی۔ تقاضا کرتے وقت جتا دیا کرتے تھے، کہ بھئی حساب، تو کوڑی کوڑی کا ہونا چاہیے' اس میں رعایت مروّت کی گنجایش نہیں"۔ سالانہ مقامی نمایش میں کبھی ان کے واسطے داخلے کا ٹکٹ ۲ر دے کر میں نے لے لیا تو فوراً بٹوا کھول کر اندر جانے سے پہلے ادا کر دیتے تھے اور اگر میرا ٹکٹ انھوں نے خریدا تو تقاضا کر کے فوراً وصول کرتے تھے۔

فرایضِ منصبی کی ادائی میں بھی غلو تھا۔ غیر معمولی محنت نے بصارت کو خراب کر دیا۔ جوانی میں پڑھنے لکھنے کا سلسلہ صبح سے نصف شب تک جاری رہتا تھا۔ یہ بھی ہوتا تھا کہ دستر خوان پر بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں، لیکن کتاب بائیں ہاتھ میں ہے، آنکھیں کتاب کی طرف اور سیدھا ہاتھ بِاقاعدہ رکابی میں پڑ رہا ہے۔ قدرت کے ساتھ ایسی سخت لڑائی کب تک رہ سکتی ہے، ہزار قویٰ مضبوط ہوں لیکن خمیازہ بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ آخر کار بصارت نے جواب دے دیا، عینک لگانے کی ضرورت لاحق ہو گئی۔

حافظہ ابتدا سے زبردست تھا، مگر دماغی کاوش نے اس کو بھی کہیں کا نہ رکھا۔ کچھ عرصے سے شاکی تھے کہ کوئی بات بھی یاد نہیں رہتی۔ اپنے اشعار بھی زبانی سُنا نہیں سکتے تھے۔

قدرت نے ذہن ایسا تیز عطا کیا تھا کہ جس کام کی طرف توجہ کرتے اس میں یدِ طولیٰ حاصل کر لیتے۔ ادیب بھی تھے اور شاعر بھی۔ کرکٹ اور ٹینس بھی خوب کھیلتے تھے مغلئی گنجفہ،

چوسر، شطرنج اور برج وغیرہ میں بھی دخل تھا، البتہ شرط لگا کر کھیلنے کے خلاف تھے۔

کتب بینی کا شوق ہمیشہ سے رہا، اردو اور انگریزی کتابوں کا ذخیرہ اچھا جمع کرلیا تھا زیادہ شاعروں کے تذکرے تلاش کر کے لاتے تھے۔ مستعمل کتب فروش ان کے شوق سے واقف ہوگئے تھے، صورت دیکھتے ہی تذکرے نکال کر رکھ دیتے۔ قیمت کی تکرار پر لطف ہوتا تھا۔ موٹر میں بیٹھنے تک تکرار کا سلسلہ جاری رہتا۔ بعض کتب فروش مکان پر کتابیں پہنچا دیا کرتے تھے۔

دوسروں سے بھی کتابیں عاریتاً مانگ کر لاتے تھے۔ واپس کرنے میں بہت اہتمام ملحوظ تھا۔ اپنی کتابیں بھی پڑھنے کو دیا کرتے تھے، لیکن حسب عادت واپسی کا تقاضا شدید ہوا کرتا تھا۔ اکثر مجھ سے شکایت کیا کرتے تھے کہ پڑھنے کے لیے کتاب تو لے جاتے ہو، لیکن واپس نہیں کرتے۔ اگر میں کہتا کہ میری کتابوں میں رکھی ہوئی ہے، تلاش کر کے آپ کی کتاب دیدوں گا تو خود میری کتابوں کا جایزہ لے کر اپنی کتاب نکال لیتے۔ جب تک کتاب نہ ملتی بے چین رہتے تھے۔

طبیعت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ روزانہ اٹھتے بیٹھتے کوئی نہ کوئی جملہ مذاقیہ زبان پر آہی جاتا تھا۔ ان کے اکثر مضامین ظریفانہ ہیں۔

ابتدائی زمانے میں سینما دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ آندھی آئے یا طوفان بارش ہو، مقررہ دن پر سینما جانا ضرور تھا۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ تنہا جائیں، کسی نہ کسی کو ساتھ ضرور لیتے۔ ہمیشہ وقت سے بہت پہلے جانے کے لیے اصرار رہتا تھا۔ بعض وقت ایسا ہوا کہ اچانک بغیر اطلاع میرے پاس آگئے، موٹر سے اترتے اترتے غل مچایا کہ "چل بھئی چل، شیروانی پہن، آج کا فلم بہت اچھا ہے۔" میں عذر کرتا کہ "ابھی بہت دیر ہے، میں نہانے جا رہا ہوں، اس کے بعد نماز عصر پڑھنی ہے، نہ چائے پی نہ حقہ پیا۔ آپ بیٹھیے اخبار پڑھیے۔" مگر وہ دم نہیں لینے دیتے تھے۔ تقاضے پر تقاضا ہوتا تھا، بار بار گھڑی دیکھتے۔ اب کچھ عرصے سے یہ شوق کم ہوگیا تھا۔ شام کو کلب جانے لگے تھے۔

ایک دن سینما بینی کے شوق نے جان ہی لے لی ہوتی۔ سنہ ۱۹۱۱ء کے دہلی دربار کے لیے حیدرآباد سے آئے تھے۔ میں علی گڑھ سے دہلی چلا گیا تھا، ایک روز سہ پہر میں سیر کرتے ہوئے دور نکل گئے۔ سر شام واپسی کا خیال تھا، اس لیے جیسٹر ساتھ نہیں رکھا۔ واپسی میں ایک

سینما گھر پر سے گزرے۔ لوگوں کو جاتے ہوئے دیکھ کر بے اختیار ہو گئے۔ ان کے شوق کا انداز کر کے میں نے بھی عذر نہیں کیا۔ پہلے شو کا وقت تھا فارغ ہو کر کچھ آگے گئے تھے کہ ایک دوسرے سینما گھر پر سے گزرے، اصرار کیا کہ اسے بھی دیکھ لو۔ میں نے کہا رات زیادہ ہو جائے گی گرم لباس ساتھ نہیں، سردی میں اکڑ جائیں گے، مگر وہ کب ماننے تھے۔ کہنے لگے "خدا مالک ہے تم چلو تو سہی"۔ مثل مشہور ہے "مردہ بدستِ زندہ" با دلِ ناخواستہ میں نے قبول کر لیا۔ تماشا ختم ہونے پر جب باہر نکلے تو خدا ہی یاد آگیا، دل کی کیفیت یہ کہ اب بیٹھ ہی جائے گا۔ گورے سپاہیوں کو دیکھا کہ سردی سے بچنے کے لیے دوڑ لگا رہے ہیں۔ مجھ سے کہا "بس زندہ رہنے کی یہی ایک ترکیب ہے، گھر تک دوڑتے چلو"۔ اب جو دوڑ شروع کی تو کشمیری دروازے تک دوڑتے ہی رہے، عادت نہ ہونے سے خستہ حال ہو گئے، وہاں ایک دوکان چائے کی تھی، بیٹھ کر چائے پی، پھر جو دوڑے تو ریل کے پل کے پاس دم لیا، وہاں بھی چائے کا دور رہا۔ الغرض چوڑی والوں تک یہی پروگرام رہا۔ زمانۂ حال تک اس واقعہ کا تذکرہ کر کے جوانی کی لاپروائیوں کا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔

مرحوم کے ادبی کارناموں کی تفصیل میں نہ لکھوں گا۔ وہ ہندوستان کی ادبی دنیا میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ مختصر یہ کہ اردو نثر کے بادشاہ تھے۔ سیدھی سادی زبان میں مطلب ادا کرتے تھے۔ عربی اور فارسی کے الفاظ کی ٹھونس ٹھانس پسند نہ تھی۔ مضامین فرحت کی کئی جلدیں طبع ہوئیں اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئیں بعض مضامین چوٹی کے بہت مقبول ہیں: مثلاً "پھول والوں کی سیر" اور "دلّی کا مشاعرہ"۔

شاعر بھی تھے۔ غزلوں کے علاوہ خاص خاص عنوانات پر نظمیں بھی لکھتے تھے۔ عروض پر کافی مہارت حاصل تھی۔ ابتدائی زمانے میں اپنا کلام فرمایش ہونے پر زبانی سنایا کرتے تھے مگر جب سے حافظے نے ساتھ چھوڑا وہ بات جاتی رہی۔

کچھ عرصے سے ایک ادبی انجمن قایم کر رکھی تھی۔ خود اس کے معتمد تھے، ہر مہینے کے آخری جمعہ کو کسی رُکن کے ہاں جلسہ ہوتا تھا۔ شاعر اپنا کلام سناتے تھے اور ایک اہلِ قلم کسی مضمون پر مقالہ پڑھتا تھا۔ تمام کاغذات اپنے پاس جمع کر رکھے تھے، اور قصد تھا کہ حالات

اچھے ہو جائیں تو ان کو کتاب کی صورت میں طبع کر دیا جائے۔ آخری جلسہ راقم کی طرف سے جمعہ کے دن ہوا اور اتوار کو ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہو گئے۔ درمیانی وقفہ میں مجھ سے ملاقات کا موقع نہ ہوا، لیکن میں نے سُنا کہ جلسے کے اخراجات کا حساب مکمّل کر لیا تھا، صرف ۴ر کا حساب نہ ملتا تھا، اس لیے معاملہ صبح پر ملتوی رکھا کہ کل جا کر حساب دے دوں گا، مگر ایسے سوئے کہ پھر آنکھ نہ کھلی۔

غیر معمولی محنت نے عرصہ سے صحت کو خراب کر دیا تھا۔ اگرچہ قویٰ قدرتاً مضبوط تھے، لیکن انتہا پسند عادتوں کی برداشت کب تک کرتے۔ پان میں لکھنؤ کا قوام کھانے کا بھی شوق کچھ دن رہا۔ اسی طرح سگریٹ پینے پر آتے تو کوئی روک نہ تھی۔ بالآخر قلب کا عارضہ لاحق ہو گیا ایسے ایسے سخت دورے پڑنے لگے کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ طبیبوں نے تاکید کی کہ آرام کی زندگی بسر کرو، تمباکو اور گوشت وغیرہ جیسی اشیا سے پرہیز کرو۔ اس تاکید کا صرف اس قدر اثر ہوا کہ گوشت کھانا ترک کر دیا تھا، آرام لینا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ موٹر میں دور دور کا دورہ برابر کرتے رہے، اگر کوئی روکتا تو کہتے "میاں! موت کا ایک دن مقرر ہے کس کس چیز سے پرہیز کیا جائے، ڈاکٹر منع کرتے ہیں تو کرنے دو۔"

روزمرہ کی زندگی میں سادگی کا اصول ہمیشہ پیشِ نظر رہا۔ نمایش اور فیشن کے قایل نہ تھے۔ لباس پر دھبّے ہوں تو پروا نہیں، ٹوپی میلی ہو تو کوئی ہرج نہیں، اس پر برش مجبوری سے ہوتا تھا۔ جوتے پر کسی نے پالش کرا دی تو ہو گئی ورنہ اپنی طرف سے کبھی توجہ نہیں کی۔ یورپین لباس اور طرزِ معاشرت کی طرف رغبت نہ تھی۔ ترکی ٹوپی اور شیروانی کے سوا کوئی لباس پسند نہ تھا قمیص اور بنیان سے نفرت تھی، جاڑے گرمی اور برسات باریک ململ کے کُرتے ہی پر گزارتے تھے۔ پائجامے کی پابندی نہ تھی، خاص خاص موقعوں پر البتہ اس کو استعمال کرتے تھے۔ گھر کی آرایش کا خیال بہت کم تھا۔ احباب نے اصرار کر کے ملاقات کا کمرا مغربی تہذیب کے مطابق آراستہ کر دیا۔ وہ اکثر بند ہی رہتا تھا۔ شکایت کرتے تھے کہ لوگوں نے بلا وجہ میرا روپیہ برباد کر دیا۔

تخت پر لکھنے پڑھنے کا کام کرتے، کبھی میز پر نہیں کیا۔ جب دیکھو تخت یا فرش پر آلتی پالتی مار کر دوں بیٹھے

لکھ رہے ہیں اور قلمدان کو میز بنا رکھا ہے۔ تھک جاتے تو فرش ہی پر لیٹ جاتے۔ آرام کرسی کے قایل نہ تھے۔ کہا کرتے تھے کہ "جو مزا فرش پر لوٹ مارنے میں آتا ہے وہ بات آرام کرسی میں کہاں"۔

اخیر زمانے میں مذہبی رنگ غالب آگیا تھا۔ پانچوں وقت کی نماز پابندی کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ موت کا خیال ہر وقت لگا رہتا تھا۔ اکثر کہا کرتے تھے "کسی روز بیٹھے بیٹھے مرجاوں گا" تقریباً تین سال کا عرصہ ہوا کہ ایک شادی کی تقریب تھی، رقص و سرود کی محفل جمی ہوئی تھی، یکایک اپنی جگہ سے اُٹھ کر میرے قریب آئے اور کہنے لگے "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب رشتۂ حیات منقطع ہونے والا ہے"۔ میں نے استعجاب سے کہا۔ "خیر تو ہے، یہ بیٹھے بیٹھے آپ کو ایسا خیال کیوں آیا"۔ جواب دیا کہ "میں بہت تکلیف میں ہوں، لوگ سمجھتے ہیں کہ اچھا ہوں"۔ میں نے کہا "بہتر ہوگا کہ اب آپ گھر جاکر لیٹ جائیں، رات بھی زیادہ گئی ہے"۔ کہتے تھے "نہیں، کسی حال بھی چین نہیں ملتا، یہیں دل بہلا کر وقت کاٹوں گا، "شاد باید زیستن" پر عمل کروں گا، ناشاد نہ مروں گا"۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی مقولے پر عمل رہا، اخیر وقت تک جوان ہمت رہے۔

راقم کو یقین ہے کہ آخرت اچھی ہوئی۔ انتقال کے شاید تیسرے دن ان کی ایک لڑکی نے خواب دیکھا کہ آپ پھولوں کی کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں، والد مرحوم بھی پہلو میں کھڑے ہیں، فرماتے ہیں "تم لوگ میرا ماتم نہ کرو، میں اچھی جگہ ہوں، مگر اب تمھارے پاس نہیں آسکتا البتہ درود شریف پڑھا کرو، اور صبر سے کام لو"۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ رویائے صادقہ تھا۔

انتقال بالکل اچانک ہوا، کسی کو خیال بھی نہ تھا کہ رخصت ہونے والے ہیں۔ ۲۶ر اپریل ۱۹۴۶ء کو حسب معمول کلب سے آئے، نماز عشا سے فارغ ہوکر کھانا کھایا، بستر پر لیٹ گئے، نصف شب کے قریب ملازم کو آواز دی کہ نل کھلا ہوا ہے، اس کو بند کردو۔ گویا کہ اپنی حیات کے چشمے کو بند کرنے کی ہدایت تھی، پھر جو چادر تان کر سوئے تو ہمیشہ کے لیے سو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم کی ملازمت سے متعلق بھی کچھ تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ان کے پاس کوئی قانونی ڈگری یونیورسٹی کی نہیں تھی۔

حیدرآباد آنے کے بعد ملازمت کا خیال ہوا تو چادر گھاٹ اسکول میں ۶۰ روپے

تنخواہ پر مددگار صدر مدرس کی خدمت قبول کرلی ۔ ان کے متعدد شاگرد اچھی اچھی خدمتوں پر ملازم ہیں ۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں جو ڈرامے کالج میں ہوتے تھے ان میں نمایاں حصّہ لیتے رہے ۔ ایکٹنگ میں خوب مہارت تھی ۔ چادر گھاٹ ہائی اسکول میں بھی انھوں نے ڈرامے کی بنیاد ڈالی، لڑکوں میں ہر دل عزیز بن گئے ۔ مدرسے میں ترقی کا دائرہ محدود تھا، اس لیے کچھ عرصہ بعد سر رشتۂ عدالت میں منتقل ہو گئے ۔ یہاں ماہانہ ۱۵ روپیے کی تنخواہ سے ملازمت کا آغاز ہوا ۔ مترجم بھی رہے اور دفتر کے منتظم بھی ۔ اس عرصے میں سر رشتے کے قانونی امتحان کی تیاری شروع کردی پہلے ہی سال تمام مضامین پر عبور حاصل کرلیا اور درجۂ اعلیٰ میں سب سے زیادہ نمبر لے کر کامیاب ہوئے ۔ اس کے بعد بہت عرصے تک اسپیشل مجسٹریٹی کے ذمّے دار عہدے پر فائز رہے ۔ مقدمات کی تکمیل میں غیر معمولی محنت کرتے تھے ۔ اکثر عدالت کے اوقات کے خلاف کام کرکے مقدمات کو ختم کرتے ۔ یہ خیال غالب رہتا تھا کہ گواہ بیان دیے بغیر واپس نہ جائیں اور سرکار پر ان کی خوراک وغیرہ کا بیجا بار نہ ہو ۔ فوجداری کام میں ان کو خاص مہارت ہوگئی تھی ۔ کچھ عرصے تک ہائی کورٹ کے رجسٹرار بھی رہے، پھر ہوم سیکریٹری کی مددگاری پر چلے گئے ۔ حکومت نے ان کے انتظامی کام کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا ۔ چنانچہ دو بڑے کمیشنوں میں ان کو سیکریٹری مقرر کیا گیا ۔ ایک مشہور کمیشن پائیگاہ کے معاملات کے تصفیے کا تھا اور دوسرا ناندیڑ کے فرقہ واری نزاعات کا ۔ ان دونوں کمیشنوں کی صدارت کے لیے برٹش انڈیا کے ہائی کورٹوں کے یورپین جج مقرر ہوئے تھے ۔ انھوں نے میرزا صاحب کی کارگزاری کی بہت تعریف کی، سرکار نے ان خدمات کا معاوضہ بھی معقول دیا ۔ ہوم آفس سے مرحوم پھر عدالتی فصل خصومات کی خدمت پر چلے گئے ۔ گلبرگے میں عرصے تک سشن جج رہے ۔ سالہا سال سے جو مقدمات تصفیہ طلب باقی تھے محنت کر کے ان کا تصفیہ کیا ۔

جب گلبرگے میں تھے تو فرایض منصبی کی ادائی میں انہماک کے علاوہ مقامی کلب سے بھی دلچسپی رکھتے تھے ۔ روزانہ شام کو کلب جانا اپنے اوپر فرض کیا تھا، شاید ہی کوئی دن ناغا گیا ہو ۔ وہ کلب کے نائب میر مجلس بھی تھے ۔ ان کے زمانے میں کلب کی بہت کچھ اصلاح ہوئی ۔ ایک نئی بات یہ کی کہ گلبرگہ میں زنانہ کلب قایم کیا ۔ بڑی کوشش سے تنہا ہزاروں روپیے چندا جمع کیا، ایک پختہ عمارت تعمیر

ہوئی۔ لیڈی ٹاسکر نے اس کلب کا افتتاح کیا۔ جب تک مرحوم گلبرگے میں رہے کلب خوب آباد رہا۔ گلبرگے سے ان کا تبادلہ صوبۂ میدک کی سشن ججی پر ہوگیا۔ جس کا مستقر خاص حیدرآباد ہے یہاں بھی غیر معمولی محنت کرکے انھوں نے پرانے مقدمات کا تصفیہ کیا۔ اس زمانے میں حکومت نے ایک جدید قانون نافذ کردیا تھا کہ سررشتۂ عدالت کا کوئی ملازم تاوقتیکہ اس کے پاس کسی یونیورسٹی کی قانونی ڈگری نہ ہو، ہائی کورٹ کا جج نہیں ہوسکتا۔ اس قانون کی وجہ سے بعض کا خیال تھا کہ اب میرزا صاحب کو ترقی نہیں مل سکتی۔ بہ ظاہر یہ خیال غلط نہ تھا لیکن ارباب حکومت نے میرزا صاحب کی غیر معمولی کارگزاری کو ملحوظ رکھ کر ان کی حد تک قانون کو بے اثر کردیا۔ چنانچہ مرحوم ہائی کورٹ کے انسپکٹنگ افسر مقرر ہوگئے۔ یہ خدمت ججی کے مساوی خیال کی جاتی تھی۔ عدالت ہائے ماتحت کی تنقیح کرکے رپورٹ کرنا ان کے فرایض میں داخل تھا۔ اس خدمت پر مامور ہونے کے بعد ان کی صحت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ باوجود اس کے وہ پوری ریاست کا دورہ پابندی کے ساتھ کرتے رہے۔ اطبا نے اگرچہ ممانعت کی لیکن فرایض منصبی کی انجام دہی کو انھوں نے ہمیشہ مقدم رکھا۔ وظیفے پر سبکدوش ہونے کے بعد بھی انھوں نے بعض اہم خدمات کو انجام دیا اور حکومت کو ان کے کام پر اطمینان رہا۔ اولاد کے معاملے میں مرحوم خوش قسمت رہے۔ ایک لڑکا دوم تعلقدار ہے اور دوسرا سیول سرجن پانچوں لڑکیاں بیاہ دی گئی ہیں اور خوش و خرم ہیں۔ اللہ تعالےٰ مرحوم کی بیوی اور لڑکیوں پر اپنا فضل شریک حال رکھے اور مرحوم کو غریق رحمت کرے!

میرزا حسین احمد بیگ

بحیثیت ادیب و شاعر

میرزا فرحت اللہ بیگ کا مزاحیہ اسلوب

اردو ادب کا دامن ظرافت سے خالی نہیں جس طرح غزل اور اس کے عشقیہ آداب، قصیدہ اور اس کی بلاغت، داستان اور اس کے پیچ در پیچ طلسمات اور عیاریاں اشرافِ طبقے کی ذہنی تسکین کا سامان تھیں۔ اسی طرح اردو نثر کے فروغ کے ساتھ ساتھ ظرافت نے بھی آہستہ آہستہ اپنے لیے جگہ پیدا کرلی کہیں یہ ظرافت ذاتی ہے جیسے غالب کے رقعوں میں، کہیں یہ داستان کی بھول بھلیوں میں تبسم کے قہقہے جلاتی ہے جیسے داستان امیر حمزہ میں عمرو عیار اور ان کی زنبیل، یا طلسم ہوش ربا کے عیاروں کی کارستانیاں۔ کبھی یہ ظرافت مغرب اور مشرق کی مزاحیہ کردار نگاری کے امتزاج سے ناول میں اپنے لیے جگہ پیدا کرتی ہے جیسے سرشار کے میاں خوجی اور سرشار کے نوابوں کے مصاحب اور ان کے کارنامے، اُن کی گفتگو۔ بالآخر اودھ پنچ اور اس کے حلقے کے ادیبوں میں یہ ظرافت مقصود بالذات بن گئی۔

اسی ظرافت نے اب سے دس یا بیس سال قبل ہمارے بعض بزرگوں کی تحریروں میں بڑے خاص اور انوکھے رنگ اختیار کیے۔ رشید احمد صدیقی نے فقرہ متضاد اور علی گڈھ کو ترکیب دے کے ایک بڑے اچھوتے اور اچھے خاصے ذہنی معیار کا ظریفانہ رنگ تیار کیا۔ پطرس نے بھی ایک طرح کی معصومیت ایک ساختہ بے ساختہ پن سے ظریفانہ مضامین لکھنے شروع کیے۔ عظیم بیگ چغتائی نے ہندوستانی شرفا میں جنسوں کے بعد میں ذرا سی کمی کے مواقع پیدا کرکے طرح طرح کے ظریفانہ افسانوں کے خمیر تیار کیے۔ عظیم بیگ چغتائی کے مزاحیہ افسانوں کے اکثر و بیشتر نوجوان شریف ہیں اور اکثر و بیشتر لڑکیاں پردا کرتی ہیں اگرچہ نوجوان شریف ہیں وہ شریر ہیں اور جو لڑکیاں پردا کرتی ہیں انھیں پردے ہی کے نیم شریفانہ عشق کی پُرلطف مصیبتیں بھی

جھیلنی پڑتی ہیں۔

اِسی زمانے میں میرزا فرحت اللہ بیگ کا نام بھی ان کے بے مثل مزاحیہ طرزِ تحریر کی وجہ سے چمکا۔ بڑی ضرورت اس کی ہے کہ میرزا صاحب کے مزاحیہ اسلوب کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے طرزِ تحریر کی تاریخ کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ میرزا فرحت اللہ بیگ کا پہلا اہم مضمون "نذیر احمد کی کہانی" جب شایع ہوا ہے تو وہ اردو کے تمام مزاحیہ ادب سے بہت ارفع و اعلیٰ تھا۔ مگر معاصرین کی ظریفانہ روایات مقابلتاً پست تھیں۔ میرزا صاحب اپنے عہد کی عام سطح سے اسی مضمون میں اس قدر اونچے اُبھر آئے تھے کہ یہ مقام وہ صرف چند مضامین میں باقی رکھ سکے۔ تمام مضامین میں نہیں۔

اس لیے میرزا صاحب کے ہاں ظرافت کے دو اسلوب ملتے ہیں۔ اِن میں ایک کو 'متین' ظرافت یا ادبی ظرافت کہہ لیجیے۔ دوسرے صحافتی ظرافت' جو اس دور میں عام طور پر رائج تھی اور جواب بھی ایک حد تک باقی ہے۔ پہلی قسم کی ادبی ظرافت کے نمونے "نذیر احمد کی کہانی" "ایک وصیت کی تعمیل" "العظمت للہ" اور اس طرح کے چند مضامین میں ملتے ہیں۔

دوسری قسم یا صحافتی ظرافت کے نمونے بہت زیادہ ہیں۔ یہ "نیرنگِ خیال"، "ساقی" اور اس قسم کے رسالوں اور ان کے ناظرین کی محبوب ظرافت تھی۔ اِس کا بڑا کام ہنسنا ہنسانا تھا۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو ہنسنا ہنسانا بجائے خود کافی وجہ جواز ہے۔ لیکن اس تمیز اور تفریق سے میرا مطلب یہ ہے کہ میرزا صاحب کا خاص میدان اس دوسرے قسم کی یعنی "ایک نواب صاحب کی ڈائری" اور "عشق کی گولیاں" جیسی ہنسانے والی ظرافت نہیں تھی۔ یہ تو ہر ذہین اور خوش مذاق آدمی کے بس کی بات ہے جو شگفتہ طرزِ تحریر بھی رکھتا ہو۔ میرزا صاحب کا اصلی میدان تو وہی پہلے قسم کی یعنی ادبی ظرافت تھی جس میں پورے اردو ادب میں ان کا ہمسر اور کوئی نظر نہیں آیا۔

اس پہلی قسم کی ظرافت کی بنیاد اشخاص، افراد، اور کرداروں کے مطالعے اور ان کے تعارف پر تھی۔ میرزا صاحب کا کمال یہ تھا کہ وہ اپنے مشاہدے کی حد تک مشاہیر اور افراد کو ڈرامائی انداز سے پیش کرتے تھے اور اس ڈرامے میں اپنے لیے بھی بحیثیت ایک فرد کے جگہ باقی

رکھتے تھے۔ اپنی ذات اور جس شخص کا وہ حال بیان کرتے اس کے درمیان معروضیت اور موضوعیت کا ایک ایسا تانا بانا تیار کرتے کہ ہمیں بھی ایک طرف تو اُنھیں کی نظروں سے اس فرد کا جائزہ لینا پڑتا ہے، دوسرے ہم اس فرد کے متعلق اپنے نقطۂ نظر اور مشاہدے کو بھی اپنے عام تاثر سے الگ ہو کے دیکھ سکتے ہیں۔

ایسے مزاحیہ مضامین میں نذیر احمد کی کہانی اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ شاید اردو نثر میں اور کہیں اس کمال سے مزاحیہ اسلوب کردار نگاری کے لیے نہیں برتا گیا ہے۔ کردار بطور کردار محسوس کے ہمارے سامنے آتا ہے اور احساس کا ذریعہ بڑا بلند پایہ اور پُر خلوص ذوق مزاح ہے۔ مزاح ایک ایسا رشتہ ہے جو دو شخصیتوں کے درمیان ہے، نذیر احمد اور فرحت اللہ بیگ کے مضمون پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو اسی رشتے سے سمجھتے تھے! اس کا ذکر میرزا صاحب نے یوں کیا ہے "میں اپنے طرزِ بیان کے متعلق معافی مانگ لیتا ہوں کیونکہ میری شوخی بعض جگہ حدِ تجاوز سے بڑھ جائے گی۔ لیکن آپ تمام قارئینِ کرام کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر مولوی صاحب خود اپنی سوانح عمری لکھتے تو اسی رنگ میں لکھتے"

اس مضمون میں میرزا صاحب کی تحریر اور کردار نگاری کی شوخی در اصل محبت کی شوخی ہے! اور یہ اسلوب کی بے تکلفی کی وجہ سے ادب بن گئی ہے، زبردستی کی ظرافت نہیں بنی۔ اس مضمون کی ہیئت اور تکنیک ادب اور حیات دونوں کے اعتبار سے انوکھی اور غیر معمولی ہے۔ کہانی کا جتنا حصہ نذیر احمد کی زبانی ہے اس میں ظرافت کی نوعیت مختلف ہے کیونکہ وہ نذیر احمد کی ظرافت ہے۔ اس ظرافت اور اپنی شوخی میں فرق قایم رکھنا فرحت اللہ بیگ کے مزاحیہ اسلوب کا بڑا کمال ہے۔

اگر تجزیہ کیا جائے کہ کیوں نذیر احمد یا سلیم یا دوسرے مشاہیر اہلِ قلم کی تصویریں میرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین میں اس قدر زندہ اور جیتی جاگتی نظر آتی ہیں، تو مصنف کی فطری استعداد اور قوتِ مشاہدہ کے علاوہ ایک اور وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے۔ عام طور پہ مشرق کا قاعدہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد مرنے والے کی تمام کمزوریاں بھلا دی جاتی ہیں، صرف اس کی اچھائیاں یاد رکھی جاتی ہیں۔ یہ عفو اور درگزر نہ صرف اخلاقی بلکہ سماجی نقطۂ نظر سے جائز اور مفید ہے۔

مشاہیر کے احسانات یا ان کی خدمتیں یاد رہ جاتی ہیں لیکن اس میں ایک نقصان بھی ہے اور وہ یہ کہ مرنے والے کی جیتی جاگتی تصویر نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ چند خصوصیات اور چند احسانات کی یاد باقی رہ جاتی ہے۔ میرزا فرحت اللہ بیگ نے نہ صرف مرنے والوں کی کمزوریوں کو یاد رکھا بلکہ ان کا ذکر بڑی محبت سے کیا۔ اردو کے جن مشاہیر کو وہ زندگی میں جتنا جانتے تھے ان کا اتنا ہی ذکر انھوں نے بلا کچھ زیادہ چھپائے ہوئے اور بلا رو رعایت کیا ہے! ورمرنے والوں کی چلتی پھرتی تصویریں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دی ہیں۔

اس قسم کی سوانح نگاری مغرب میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ کسی خاص سوانح نگار سے تو میرزا صاحب کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ایک حد تک ان کا فن Lytton Strachey کی طنزیہ سوانح نگاری سے ملتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ طنز کی جگہ میرزا صاحب نے محبت آمیز شوخی کا حربہ استعمال کیا ہے۔ ان کا مقصد بھی اسٹریچی سے مختلف ہے۔ وہ جھوٹی قدروں کی قلعی نہیں کھولنا چاہتے جو لٹن اسٹریچی کا مقصد ہے۔ اس قسم کی جامہ دری یا Debunking کے لیے ضرورت اس کی تھی کہ وہ ایسے کرداروں کا انتخاب کرتے جن سے انھیں کوئی خاص ہمدردی نہیں تھی۔ اس کے برعکس میرزا صاحب نے ایسی شخصیتیں اور ایسے کردار چنے ہیں جن سے انھیں بے حد محبت تھی۔ ان کی ہمدردی ایسی سچی ہمدردی اور ان کا خلوص ایسا سچا خلوص تھا کہ وہ اپنے استاد یا اپنے دوست کی یاد کے اطراف کسی قسم کے جھوٹ یا ریاکارانہ پرستش کا ہالہ برداشت نہیں کر سکتے۔ جس کا وہ ذکر کرتے تھے اسے سب سے پہلے انسان سمجھتے تھے۔ انسان کے روپ میں پیش کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ بحیثیت انسان اس کی یاد باقی رہ جائے۔

خوش طبعی ان کے اسلوب نگارش کا سب سے بڑا آلہ تھا۔ اس خوش مذاقی کی تعریف عظمت اللہ خاں نے انھیں کا تعارف کراتے ہوئے ان الفاظ میں کی ہے کہ " پڑھنے والے یہ بھی مانتے جائیں کہ آپ نے ٹھیک لکھا ہے اور ہنستے بھی جائیں۔" پھر عظمت اللہ خاں نے اس ہنسی کی مزید تعریف کی ہے "ہنسی ایک ذہنی کیفیت ہے، ایک نفسی انبساط ہے۔ اگر دل و دماغ پر ایک انبساط کی کیفیت چھا جائے۔ اور کبھی کبھی لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل جائے اور ایک آدھ دفعہ قاری پھول کی طرح کھل کھلا کر ہنس دیں تو ایسا مضمون خوش مذاقی کا بہترین نمونہ ہوگا۔"

خوش مذاقی کی ایک بڑی خصوصیت انھوں نے یہ بھی قرار دی ہے کہ اس میں رکاکت اور سوقیاپن بالکل نہ ہو۔"

"خوش مذاقی کی یہ تعریف میرزا صاحب کے ایک مضمون "نواب صاحب کی ڈائری" کی تمہید کے طور پر کی گئی ہے۔ اس مضمون پر یہ تعریف پوری اُترے یا نہ اُترے، میرزا صاحب کے اُن مضامین پر یقیناً پوری اُترتی ہے جو مشاہیر کی کردار نگاری کے شاہ کار ہیں۔

جہاں تک ادیب زندگی کی نقاشی کا ذمّہ دار ہے، معاشری زندگی کی تصویروں کا تحفظ کرکے تمدن کی اقدار نمایاں کرنے میں پہلا مرتبہ تو ٹھوس کردار نگاری ہی کو حاصل ہے جس میں میرزا صاحب نے نذیر احمد وغیرہ کی تصویریں بڑے کمالِ فن سے پیش کی ہیں۔ اس کے بعد سماجی نمونوں یا Social types کا مقام ہے۔ یہ سہ ابعادی نہیں دو ابعادی ہوتے ہیں۔ ان سماجی نمونوں کے نقوش بحیثیت افراد کے گہرے نہیں ہوتے۔ لیکن یہ سماجی زندگی اور اس کے معاشی پس منظر کی اہم حقیقتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

زندہ کرداروں کے علاوہ میرزا صاحب کے تصویر خانے میں سماجی نمونے بھی ہیں۔ جیسے صاحب بہادر، بہرا وغیرہ۔ ان میں سے اکثر نمونے نئے نہیں۔ مثلاً نذیر احمد کے ابن الوقت سے لے کر اب تک صاحب بہادر کے بہت سے نمونے اردو مزاحیہ ادب میں پیش ہو چکے ہیں میرزا صاحب کے صاحب بہادر بھی روایتی ہیں۔ اصل میں ادبی نقطۂ نظر سے اس مضمون کی جان خود مصنف اور ڈاکٹر ڈگن ہیں جو اب سر جمشید ڈگن ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر ڈگن سے مصنف کی ملاقات بڑی سرسری ہے مگر ان کی شخصیت کا تاثر اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ ڈاکٹر ڈگن تو زندہ انسان معلوم ہوتے ہیں اور صاحب بہادر محض چند انسانی کمزوریوں کا مجموعہ۔ جو حضرات ڈاکٹر ڈگن سے ملے ہوں گے وہ میری رائے سے اتفاق کریں گے کہ چند سطروں میں ان کی شخصیت اس طرح بیان کر دی گئی ہے گویا ہم انھیں سچ مچ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

سماجی نمونوں میں غالباً سب سے زیادہ کامیابی سے میرزا صاحب نے "بہرے" کو پیش کیا ہے۔ اس اہم شخصیت اور اس کے فن اور پیشے کے تمام اسرار و غوامض کو جس طرح مزے لے لے کے اور جس بے ساختہ شوخی اور تفصیل سے میرزا صاحب نے بیان کیا ہے یہ

انھیں کا حصہ ہے اور پھر یہ بہرا ہر بہرا نہیں۔ یہ ایسا بہرا ہے جو اپنے فن میں کامل اور اپنے پیشے میں کامیاب ہے۔ وہ اپنے گروہ کا ایک نمونا ہے، مگر ایسا مکمل نمونا کہ اس میں خود بخود ایک طرح کی انفرادیت آگئی ہے۔

تیسرے قسم کے کردار یا کرداروں کے خاکے جو میرزا صاحب کے یہاں ملتے ہیں سنکی اور نرالے ہیں۔ یہ عجیب اور بے مرکز لوگ زندگی کے مطالعے کے لیے صرف اسی حد تک کار آمد ہیں کہ یہ ایک خاص قسم کے سماجی حالات یا معاشی پس منظر میں ہی پیدا ہو سکتے تھے۔ اس سے قطع نظر ان کی ساری دلچسپی محض ان کے نرالے پن یا ان کی بے مرکزی کی وجہ سے ہے۔ سماجی پس منظر کی جانچ میں ان کا کوئی اہم مقام نہیں اور ان سے جو ظرافت پیدا ہوتی ہے وہ مقصود بالذات ہے۔ اِن کرداروں کا نرالا پن نمایاں کرنے میں میرزا صاحب مبالغے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ خوش طبعی کی جو تعریف عظمت اللہ خاں نے میرزا صاحب سے منسوب کی تھی وہ ان خاکوں پر کبھی پوری اُترتی ہے کبھی نہیں اُترتی۔ دیوڑ بیگیانِ خورد، دادا جان، نواب عاشق حسین خاں، سب مزاحیہ سے زیادہ نقل اور کردار کے سوانگ ہیں۔ غالباً ان میں سے اکثر براہِ راست زندگی سے لیے گئے ہیں۔ لیکن مشاہیر کے کردار اُجاگر کرنے میں جس فنکاری کی وجہ سے میرزا صاحب کی خوش طبعی زندگی کے نقوش اُبھارنے کے لیے وقف ہو جاتی تھی، یا ذمہ داری یہاں مفقود ہے۔ ذرا موقع ملا اور میرزا صاحب نے لطیفوں اور مذاق کا سلسلہ چھیڑ دیا۔

اِن سب کرداروں میں سے دیوڑ بیگیانِ خورد میں زندگی کی کسک ہے۔ اس خاکے کے تماشے اور سوانگ میں ایک ایسے شخص کی ٹریجڈی بھی شامل ہے جو اپنے آپ کو حالات اور اصلی واقعات کے سانچے میں ڈھال نہیں سکتا۔ اور اِس لیے زندگی اُسے دھکّے دیتی ہوئی اس کے پاس سے گزر جاتی ہے اور اُسے اکیلا چھوڑ جاتی ہے۔

میرزا صاحب کے مضامین کی ایک قسم وہ ہے جس میں انھوں نے ظرافت کی بنیاد واقعہ نگاری پر رکھی ہے۔ جیسے "پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکّر" "مُردہ بدست زندہ" اور "غلام وغیرہ۔ اِن میں ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کے بعض پہلوؤں کا مطالعہ ہے۔ ان مضامین کی ظرافت میں ثقہ پن ہے۔ ظرافت ہلکی اور لطیف ہے، اور جہاں واقعہ نگاری میں کوئی کسر

رہ جاتی ہے ظرافت اس کمی کو پورا کر دیتی ہے۔

بہت سے ظریفانہ مضامین ایسے بھی ہیں جو آج سے دس سال قبل کی عام اردو صحافت کے بعض رجحانات کے آئینہ دار ہیں۔ گزشتہ دس سال یا بیس برس کے عرصے میں بعض موضوعوں پر اکثر مزاحیہ نگاروں نے مضامین لکھے، یہ موضوع بہت مقبول تھے۔ کتّوں کے متعلق پطرس کا ایک بڑا دلچسپ مضمون شایع ہوا تھا۔ میرزا صاحب کا مضمون ایک لحاظ سے اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے لیکن اس میں ظرافت دھماچوکڑی بن گئی ہے۔ اسی زمانے کے رسالوں کا ایک محبوب مزاحیہ موضوع آزادی حاصل کر لینے کے بعد ہندوستان کے سودیشی راج کا خاکا اُڑانا تھا۔ طرح طرح کی دلچسپ پیش قیاسیوں سے اس موضوع میں بڑی جان پڑ گئی تھی اس کا کامیاب ترین نمونا شوکت تھانوی کا مضمون "سودیشی ریل" تھا۔ اس کے مقابلے میں میرزا صاحب کے "دادا جان اور آزاد نگارستان" میں کوئی خاص بات نہیں۔ دادا جان کو زندگی سے کوئی واسطہ نہیں اور آزاد نگارستان کی پارلیمان کو ظرافت کے قرائن و آداب سے بھی دور کا لگاؤ نہیں۔ جہاں تک واقعات کا تعلق ہے اس ذیلی برّ اعظم کی آزادی نے اب تک کامیڈی سے بہت زیادہ ٹریجڈی کے مناظر پیش کیے ہیں لیکن اُس زمانے میں ایسے تاریک مستقبل کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہیں ہو سکتا تھا۔

صحافتی ظرافت کی خاص پیداوار "عشق کی گولیاں" ہے پہلے اس مضمون کا صرف نصف حصہ شایع ہوا اور ہندوستان بھر کے مزاحیہ نگاروں کو دعوت دی گئی کہ وہ اس کی تکمیل کریں۔ تقریباً تمام مشہور مزاحیہ نگاروں نے اس پر قلم اٹھایا۔ ہر ایک کی تکمیل مختلف اور اپنی جگہ کافی منفرد اور دلچسپ رہی۔ بالآخر میرزا صاحب نے خود بھی اس کی تکمیل کی۔ یہ انھیں کی چیز تھی، انھیں کا رنگ تھا، وہی سب سے زیادہ کامیاب رہے۔

کچھ ہی عرصے بعد اردو ظرافت پر زوال آیا۔ میرزا صاحب ادبی تنقید اور تحقیق میں مصروف ہو گئے اور اس سلسلے میں جو کام انھوں نے انجام دیا ہے اس میں بھی ان کا احسان اردو پر ہمیشہ رہے گا۔ پطرس صاحب نے آل انڈیا ریڈیو کی سرداری سنبھالی یہاں تک کہ ایک اور سردار نے انھیں اس ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا مگر ظرافت کی لہر واپس نہیں آئی عظیم بیگ

چغتائی چل بسے۔ شوکت تھانوی جو ان سب میں کم درجے کے ظریف اور کمتر درجے کے
ادیب تھے طرح طرح کے خرافات تصنیف کرتے رہے۔ ایک رشید احمد صدیقی باقی ہیں۔ آج
اردو کے ان نامی گرامی مزاحیہ نگاروں کی جانشینی کرنے والا کوئی نہیں۔

ایک جگہ میرزا صاحب نے انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ زندہ دل اور مُردہ
دل۔ وہ لکھتے ہیں۔" زندگی کے بس دو ہی پہلو ہیں۔ زندہ دلی اور مردہ دلی۔ ایک وہ لوگ
ہیں جو مصیبت میں بھی ہنستے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو خوشی میں بھی روتے ہیں۔ ایک مرنے
کو جینا سمجھتے ہیں۔ دوسرے جینے کو مرنا۔ زندگی کے انہی دونوں پہلوؤں نے کبھی مذہب کی شکل
اختیار کی اور کبھی فلسفے کے مکتبوں کی صورت۔ غرض دنیا بھر کے انسانوں کو دو گروہوں میں
تقسیم کر دیا۔ ایک روتی صورت۔ دوسرے ہنستی صورت۔ کوئی انشا بنا اور کوئی میر"

میرزا صاحب نہ صرف زندہ دل تھے، وہ زندہ دلوں کو سمجھ بھی سکتے تھے۔ زندہ دل شاعروں
مثلاً انشا، نظیر اکبر آبادی اور داغ وغیرہ کا انھوں نے سیر حاصل ادبی تبصروں میں جائزہ لیا ہے۔
ایسے زندہ دل شعرا کے کلام پر جب وہ ظریفانہ تمہید یا اشاروں سے ہٹ کر سنجیدگی سے تنقید
کرتے ہیں تو اسلوب کی ظرافت تنک کی گنجایش پیدا نہیں ہونے دیتے۔ ہلکی ہلکی اور متین سی
خوش طبعی البتہ کہیں کہیں پھوٹ نکلتی ہے۔ یہ ان کی تنقید کی سچائی اور ان کی اہلیت کی دلیل
تھی کہ وہ اپنے موضوع کی زندہ دلی کو صحیح روشنی میں پیش کرنے کے لیے خود اپنی ظرافت کو ملتوی
کر سکتے تھے لیکن یہاں بھی ماننا پڑے گا کہ میرزا صاحب کی تنقید کا سانچہ زیادہ تر رسمی اور روایتی
تھا اور اس میں ظرافت کی گنجایش کم ہی ہے۔

اگر تنقید میں انھوں نے زندہ دلی کو استعمال بھی کیا ہے تو تنقیدی مقصد کے لیے۔ حکیم
آغا جان عیش پر جو مضمون لکھا ہے وہ ادبی تنقید کا شاہکار گنا جا سکتا ہے۔ "آب حیات" کے مصنف
کی عصبیت ان کی طرفداریوں اور غلط بیانیوں کے متعلق اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ مگر
جس طرح سے میرزا فرحت اللہ بیگ نے ذوق کے متعلق آزاد کی استاد نوازی کا خاکا اڑایا ہے
یہ انھیں کا کام تھا۔ ہُد ہُد کے واقعے کا تجزیہ بجائے خود ایک ادبی شاہکار ہے۔ آزاد کا مقصد
انھوں نے یہ قرار دیا ہے کہ وہ ذوق کے حریفوں، غالب اور مومن کا مذاق اڑا کر ان کی شان میں

بٹّہ لگانا چاہتے تھے۔ اس حصّے میں میرزا صاحب نے زندہ دلی کو اس لیے برتا ہے کہ آزاد کی زندہ دلی کا اور کسی حربے سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے بعد میرزا صاحب اپنی ذاتی زندہ دلی کو تہ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اُنھیں سنجیدگی سے حکیم آغا جان عیشؔ کے کلام کا تجزیہ کرنا ہے اور آگے بڑھ کر ان کے کلام کے اُس پُر درد حصّے کا ذکر ہے جو دہلی سے متعلق ہے۔ میرزا فرحت اللہ بیگ خوش قسمت تھے کہ ۱۸۵۷ء کے قتلِ عام کا اُنھوں نے بزرگوں سے ذکر ہی سنا اُس کو بھگتا نہیں۔ اور ۱۹۴۷ء کے قتلِ عام سے کچھ مہینے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو گئے انھوں نے حکیم آغا جان عیش کا یہ بند نقل کیا ہے۔

فلک کی آنکھ نہ تھی جن کو دیکھنے پاتی　　نہ تھی مجال صبا کی جو اُن تلک جاتی
خدا نے دی تھی انھیں ایسی عصمتِ ذاتی　　کہ نامِ غیر جو سنتیں تو شرم آجاتی
فلک نے بخشا ہے ان کو لباسِ عریانی
ہے ستر اُن کے لیے ان کی پاک دامانی

میرزا صاحب نے خود بھی ایک نظم لکھی جس میں دہلی کا ذکر بطور یادِ وطن کے ہے شہر آشوب کے انداز میں نہیں۔ انھیں ایک جگہ ماضی کی تباہی کا بھی خیال آ گیا ہے۔

اور سامنے ہی قلعے کا وہ منظرِ مایوس　　وہ شمعِ زباں دانی کا ٹوٹا ہوا فانوس
اک حُسن کہ ہے چادرِ ویرانی میں ملبوس　　تھا ہند کا پہلے جو کبھی مرکزِ ناموس
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

میرزا صاحب کو کیا خبر تھی کہ جس جمنا کے کنارے کے متعلق وہ لہک لہک کے اپنی نظم سنایا کرتے تھے اس پر لاکھوں قتل ہوں گے، عورتوں کی عصمتیں پھر سے لٹیں گی بچّوں کا پھر سے خون بہایا جائے گا، وہاں سے نذیر احمد کی اولاد انتہائی بے بسی کے عالم میں لاہور بھاگے گی اور اسی کنارے پر دہلی کے تمدّن کی شمع کو بُجھنے سے بچانے کی کوشش میں مہاراج جی کی چتا بھڑک اُٹھے گی۔

اردو میں زندہ دلی کی ایک روایت بھی ہے جو دہلی کے تمدن اور دہلی کی زبان کے چٹخارے کے ساتھ ایک پشت سے دوسری پُشت تک منتقل ہوتی رہی ہے

اور دیکھنا یہ ہے کہ اس کی زندہ دلی کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ لاہور، کراچی، حیدرآباد، پشاور اور ڈھاکے میں کس طرح جلتے رہیں گے۔ لیکن اگر اردو زبان زندہ رہ گئی تو جہاں کہیں وہ سمجھی اور پڑھی جائے گی وہاں میرزا فرحت اللہ بیگ کا نام زندہ رہے گا۔ زندہ دل کم ہوتے ہیں۔ وہ سچے معنوں میں زندہ دل تھے اور فارسی کا ایک پُرانا شعر ہے جو کبھی پُرانا نہیں ہو سکتا۔

هرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

عزیز احمد

مرزا فرحت اللہ بیگ کا مزاح

میرزا فرحت اللہ بیگ بلاشبہ اردو کے چوٹی کے مزاح نگاروں میں اپنا مقام پیدا کر چکے ہیں۔ یہ کہنا بھی شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو مزاح نگاری میں انھوں نے خود ایک نیا راستہ کھولا تھا۔ میرزا سے پہلے اس طرز کی مزاح نگاری کے نمونے اردو میں یا تو نظر نہیں آتے یا اگر نظر آتے ہیں تو اتنے شاذ ہیں کہ ان کا ہونا نہ ہونے کے برابر ہے۔

نثر میں مزاح نگاری کا چسکا انیسویں صدی کے نصف آخر کے مشہور مزاحیہ اخباروں نے پیدا کیا، جن میں "اودھ اخبار" اور "اودھ پنچ" سب سے پیش پیش تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان اخباروں نے مزاحیہ انداز کا خاکا انگریزی کے بعض مسلمہ مزاحیہ اخباروں سے اڑایا تھا، جن میں "پنچ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ لیکن اُس زمانے کے مشہور مزاح نگاروں نے کبھی انگریزی طرز اور خیالات کا ترجمہ کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ خود اپنے زمانے اور اپنے ماحول سے سیاست اور سماج کے مضحک حالات اور واقعات کو موضوع بنا کر اپنے زمانے کے مذاق اور اپنی زبان کے مزاح کے مطابق مزاح نگاری کی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے اور انگریزی خیالات اور طرز کے خاکے اڑانے کی کوشش کرتے تو اس سے ایک طرف تو اردو زبان کی حقیقی لطافت کو دھکا لگتا، دوسرے انگریزی مزاح کے نمونے اردو پڑھنے والوں کو زیادہ متاثر نہ کر سکتے، کیونکہ اردو خوانوں کے مُنہ کو انشا، جرات اور رنگین کی ظرافت کا خون لگا ہوا تھا، یہ ٹھیرے "ہنسوڑا اور وہ مقطع"۔ انگریزی مزاح کی تقلید سے اردو دانوں کا مزا کرکرا ہو کر رہ جاتا۔ اسی سے منشی سجاد حسین اور ان کے رفقا کی مزاح نگاری کی خصوصیت کی طرف بھی اشارا ہو جاتا ہے۔ اُن کی مزاح نگاری، مخصوص مثالوں کے قطع نظر، عام طور پر قہقہاریز اور قہقہہ زا ہوتی

تھی۔ جو موضوع کے اصلی خدوخال کو کم وبیش برقرار رکھ کر، حسن بیان کے ذریعے پیدا نہیں کی جاتی تھی، بلکہ ان کو مسخ کرکے اور بگاڑ کر حاصل کی جاتی تھی۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح خاص ساخت کے آئینے صورتوں کو بگاڑ کر اور مسخ کرکے دکھاتے اور قہقہوں کی گونج برپا کردیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے مزاح کا راز مضحک الفاظ اور خیالات کے استعمال میں مضمر ہوتا ہے۔ وہ الفاظ کی شعبدہ بازی ہوتی ہے، اور الفاظ کی شعبدہ بازی ایک پھلجھڑی ہے جو شرارے اڑاتی اور غائب ہوجاتی ہے۔ اس طرح کی مزاح کا بھی کم وبیش یہی اثر ہوتا ہے اور معنوی اعتبار سے اس کا اثر کچھ زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہوسکتا۔

"اودھ پنچ" کی مزاح نگاری سے پہلے، نثر میں مرزا غالب کے لطیف مزاح کے نمونے موجود تھے لیکن ہر باکمال دماغ کی پیداوار کی طرح، میرزا کا انداز مزاح بھی نہایت لطیف اور شخصی تھا۔ اسی لیے وہ عام نہیں ہوسکتا تھا۔ اگر کہیں اس کی کچھ جھلک دکھائی پڑتی ہے تو وہ محمد حسین آزاد کی تحریر ہے۔ لیکن آزاد کے پاس طرز ادا کے مقابلے میں لفظی صناعی زیادہ تھی اور پھر دونوں کی مزاح کی نفسیت جدا ہے۔ آزاد ایک باکمال صناع کی طرح نپے تلے اور سڈول بنائے ہوئے جملوں کے پرے کے پرے جماتے چلے جاتے ہیں اور میرزا غالب کی تحریروں میں جہاں کہیں مزاح ہے، وہ خودرو معلوم ہوتا ہے۔ غالب کی صناعی، سادگی کی صناعی، سادا پُرکاری کی صناعی اور آمد کانی ہے۔

میرزا فرحت اللہ بیگ کے زمانے میں ملا رموزی کے مزاح کو خاصی مقبولیت حاصل تھی ملا صاحب کے مزاح کا آغاز "گلابی اردو" سے ہوا۔ اس مزاح میں جملوں کی متروک وضع کی ساخت مخصوص اور غیر معتاد بناوٹ کا بڑا حصہ ہوتا ہے اور یہی ملا صاحب کا خاص انداز ہوگیا ہے۔

میرزا فرحت اللہ بیگ ان ادیبوں میں سے ہیں، جن کی طبیعتیں پختگی کو پہنچ کر بار آور ہوتی ہیں اس صدی کے عشرۂ دوم سے پہلے تک ان کی طبیعت کے اصلی جوہر تحریر میں نہیں کھلے تھے۔ "گفتار کے غازی" تو وہ شروع ہی سے تھے اور حیدر آباد میں ان کے نجی دوستوں کی صحبتیں، ان کے دم قدم سے گلزار بنی رہتی تھیں۔ لیکن جب میرزا رفیق بیگ صاحب نے اپنا ماہوار رسالہ "نمائش" جاری کیا تو گویا میرزا فرحت اللہ بیگ کے لیے مشق تحریر کا میدان

ہاتھ آیا اور ان کے چھپے ہوئے جوہر "الم نشرح" ہونے لگے۔ خدا بخشے، مرحوم عظمت اللہ خاں کی جدتِ طبع نے بھی اسی زمانے میں ہاتھ پیر نکالے تھے۔ "مرزا الم نشرح" اور عظمت اللہ خاں کی جوڑ خوب تھی لیکن عظمت اللہ خاں نے جلد ہی نظم کو اپنا مخصوص میدان بنا لیا اور میرزا فرحت اللہ بیگ نثر کے میدان میں بڑی حد تک تنہا رہ گئے۔ میرزا فرحت اللہ بیگ نے "مضامین فرحت" حصہ چہارم میں، عظمت اللہ خاں کے انتقال کے بعد مضمون لکھتے ہوئے اپنی اور مرحوم عظمت اللہ خاں کی باہمی ادبی معاونت کی طرف اپنے مخصوص انداز میں اشارا کیا ہے۔ یہ معاونت عظمت اللہ خاں کی بے وقت موت کی وجہ سے ختم ہو گئی۔

میرزا فرحت اللہ بیگ کے اوّلین مضامین میں "نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ اُن کی زبانی"، "نواب صاحب کی ڈائری"، "کل کا گھوڑا"، "۱۲۶۱ھ میں دہلی کا یادگار مشاعرہ" وغیرہ اسی زمانے میں منظرِ عام پر آئے۔ ان مضامین میں لطف گویائی کا جو نیا انداز بروئے کار آیا تھا، اس نے پڑھنے والوں کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ نقاد نظریں بھی فوراً تاڑ گئیں کہ اردو ادب کے آسمان پر ایک نیا ستارا طلوع ہو رہا ہے۔ غرض آغاز اچھا تھا، قبول عام فوراً استقبال کو دوڑی اور "طلب اور رسد" کے مدِ نظر، دیکھتے ہی دیکھتے "میرزا الم نشرح" کے مضامین پر مضامین اور مضامین کے بعد، مجموعوں پر مجموعے شایع ہونے لگے۔ قبولیت عام نے ان میں اب خود اعتمادی بھی پیدا کر دی تھی، اور میرزا فرحت اللہ بیگ نے زیادہ عرصے تک "میرزا الم نشرح" کے پردے میں چھپا رہنا مناسب نہ سمجھا اور اس لبادے کو اتار پھینکا۔

مزاح میں یوں بھی قبولیت کی دعوت عام ہوتی ہے۔ میرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کی مخصوص مثال میں ایک طباع ذہن، سنجیدہ مذاق اور صاف ستھری زبان کا میل تھا۔ ان کا فوراً ہی شہرت کے بلند مقام پر نہ پہنچنا تعجب کا سبب ہوتا۔

مرزائے مرحوم خود بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ اردو ظرافت نگاری میں ایک نیا راستہ کھول رہے ہیں۔ چنانچہ مضامین کی چوتھی جلد کے دیباچے میں انھوں نے اس کا اظہار کیا ہے۔

"بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کو مجھ سے کچھ کام لینا مقصود تھا۔ وہ پورا ہو گیا اور مجھ کو "اشخاص رفتہ" کی فہرست میں داخل کر دیا گیا۔ "خوش مذاقی"

کی سڑک کی داغ بیل مجھ جیسے گمنام شخص کے ہاتھوں ڈلوائی گئی۔ فوراً ہی دوسرے ادیب، کُدال، پھاوڑے لے کر آ گئے، اور تھوڑے ہی دنوں میں یہ راستا ایسا صاف ہو گیا کہ ہر چھوٹا بڑا اس پر بے تکان چلنے لگا۔"

ممکن ہے کہ کوئی اسے خودستائی پر محمول کرے، جس کے لیے شعر کی طرح خوش مذاقی کا پیرایا بھی وجہ جواز بن جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس زمانے میں عظمت اللہ خاں مرحوم اور میرزا فرحت اللہ بیگ نے اس میدان میں قدم رکھا تھا، انھیں یہ میدان خالی اور یہاں سے وہاں تک چٹیل نظر آ رہا تھا۔ ان کے سامنے مزاح کے ویسے نمونے موجود نہ تھے، جن کے دیکھنے کی ان سنجیدہ مزاج ادیبوں کو خواہش تھی۔ چنانچہ عظمت اللہ خاں نے میرزا صاحب کے مضمون "ایک نواب صاحب کی ڈائری کے چند پراگندہ صفحے" پر جو تعارفی نوٹ لکھا تھا، اس میں صاف طور پر اس حقیقت کو ظاہر کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"ادبِ اردو میں جہاں اور بہت سی باتیں ناپید ہیں، اس قسم کی ظرافت بھی، جسے انگریزی میں "لائٹ ہیومر" کہتے ہیں اور جس کا ترجمہ ہم نے 'خوش مذاقی' مناسب سمجھا ہے، بالکل مفقود ہے۔"

آگے وہ "خوش مذاقی" کیا ہے، سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں:-

"خوش مذاقی کی تعریف بہت مشکل چیز ہے۔ البتہ اس کے مفہوم کو اس طرح سمجھا سکتے ہیں کہ آپ ایک معمولی سا مضمون لکھیں، اس سرخی سے "ایک روپیے کی سرگزشت" اور اس کو اس طرح لکھیں کہ پڑھنے والے یہ بھی مانتے جائیں آپ نے لکھا ہے اور ہنستے بھی جائیں۔ ہنسی کے یہ معنی نہیں کہ آدمی قہقہے کا بم ہی اُڑا دے، کِھل کِھلا کر بندوقوں کی باڑ سی ہی داغ دے۔ ہنسی ایک ذہنی کیفیت ہی ہے، ایک طرح کی بشاشت یا زیادہ صحت کے ساتھ یوں کہیے کہ ایک نفسی انبساط ہے۔ اگر دل و دماغ پر ایک انبساط کی کیفیت چھا جائے اور کبھی کبھی لبوں پر مسکراہٹ کھیل جائے اور ایک آدھ دفعہ قارئیں پھول کی طرح کِھل کِھلا کر ہنس پڑیں، تو ایسا مضمون

خوش مذاقی کا بہترین نمونا ہوگا۔"

اقتباس اس قدر طویل ہوگیا لیکن میرزا فرحت اللہ بیگ کے سامنے مزاح کا جو معیار تھا اس کو سمجھنے کے لیے اس کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ خوش مذاقی کا یہ معیار گو عظمت اللہ خاں کے قلم سے نکلا ہے، لیکن اسے عملاً میرزا فرحت اللہ بیگ کا معیار ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ میرزا صاحب نے خود اس بارے میں کچھ نہیں لکھا، لیکن ان کے مضامین زبانِ حال سے یہی کہتے ہیں اور یہی معیار ان کی تحریروں سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ عظمت اللہ خاں کی یہ تعریف دراصل "خوش مذاقی" کی توضیح ہے۔ آگے چل کر وہ خوش مذاقی کی خصوصیات بتاتے ہیں:۔

"خوش مذاقی کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رکاکت اور سوقیاناپن بالکل نہ ہو اور منطقی پینترے اور داؤ پیچ ذہن کے لیے پُرلطف ورزش بھی ہو جائیں۔"

اس معیار پر عظمت اللہ خاں کی نظر میں، اپنے زمانے کے مزاح نگاروں میں سے اگر کسی کی تحریریں ٹھیک اتر سکتی تھیں، تو وہ میرزا فرحت اللہ بیگ ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"اردو ادب میں خوش مذاقی کی کمی کے مدِ نظر ہم اس ٹوہ میں تھے کہ کوئی اس قسم کا نفیس اور گدگدانے والا صاحب قلم ہاتھ لگے۔ ہماری نظر ایک صاحب پر تھی لیکن کچھ تو طبعی کاہل وجودی اور بہت کچھ عدیم الفرصتی کی وجہ سے ان کو لکھنے پر آمادہ کرنا، خیر جوئے شیر لانا تو نہیں، ہاں کسی نو دریافت محبوبہ کے رام کرنے سے کم نہ تھا۔ یہ انھیں کے قلم کی ستم ظریفی ہے اور انھوں نے اس کو پسند فرمایا کہ "میرزا الم نشرح" کے نام سے پردے میں اپنے آپ کو مخفی رکھیں۔ ہماری نظر میں ان کا مضمون "ایک نواب صاحب کی ڈائری کے چند پراگندہ صفحے"۔ جو قارئین کے ملاحظے میں پیش ہیں اور اسی قبیل کے مضامین جو آیندہ ہدیۂ ناظرین ہوں گے، "خوش مذاقی" کی اُن خصوصیات سے سجے اور سنوارے ہوئے ہیں، جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔ مطالعے کے بعد ہمیں یقین ہے کہ یہ بات آپ پر خود "الم نشرح" ہو جائے گی۔"

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ میرزا فرحت اللہ بیگ کو میدان میں لانے میں عظمت اللہ خاں کا بڑا ہاتھ تھا۔ عظمت اللہ خاں خود بھی "خوش مذاقی" کا پاکیزہ حس رکھتے تھے، "ولی را ولی می شناسد" کے مصداق، میرزا فرحت اللہ بیگ میں، مزاح یا خوش مذاقی کے جو جوہر پوشیدہ تھے، وہ عظمت اللہ خاں کی نظر سے چھپے نہیں رہ سکتے تھے۔ انھوں نے اس کا پتا چلایا اور اردو ادب کے فائدے کی خاطر استعمال کیا۔

میرزا فرحت اللہ بیگ کی تحریروں کو جب ان سے پہلے کے مزاح نگاروں کی تحریروں کے مقابلے میں رکھ کر پڑھتے ہیں، تو ہم کو اظہار اور خیال ہر لحاظ سے ان میں ایک نئی دنیا نظر آتی ہے۔ سب سے پہلی اور نمایاں خصوصیت جو میرزا صاحب کے مضامین میں دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ میرزا صاحب بعض اور مزاح نگاروں کی طرح قہقہے بلند کرتے ہوئے انشا کے میدان میں نہیں اُترتے، بلکہ وہ نہایت متین اور سنجیدہ لب و لہجہ بنا کر سامنے آتے ہیں۔ لیکن ان کی یہ سنجیدگی معنی خیز ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں اپنی کامیابی اور اثر کا یقین ہو جانے کے بعد وہ کبھی کبھی پہلا طریقہ بھی اختیار کرتے دکھائی دیتے ہیں، لیکن سنجیدگی ان کی خوش مذاقی کی ایک خصوصیت بن گئی ہے۔ ان کی سنجیدگی اور ان کی خوش مذاقی کے درمیان خطِ فاصل کھینچنا مشکل ہے۔ ان کی سنجیدگی میں مزاح پوشیدہ ہے اور مزاح میں سنجیدگی۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ میرزا فرحت اللہ بیگ کے صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جائیے آپ کو کہیں الفاظ کی صورتوں کو مسخ کر کے، جملوں کی ساخت کو توڑ مروڑ کر، اور صرف و نحو کی ترتیب کو تتر بتر کر کے، یا خیال کو مسخ کر کے مضحک صورتیں پیدا کرنے کی مثالیں نہیں ملیں گی اور اگر ملیں گی تو شاذ و نادر اور وہ بھی ادبی لطف سے خالی نہ ہوں گی۔ میرزا صاحب کی تحریر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ سنجیدہ لب و لہجے کے بیچ بیچ میں کہیں کہیں مزاحیہ جملے اور فقرے اس انداز سے آجاتے ہیں کہ ان کی ساری سنجیدگی بناوٹی معلوم ہونے لگتی ہے، اور عبارت میں تبسم کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ مثال کے لیے یہ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:-

(۱) "بہرحال یہ فطرت انسانی کا خیال تھا، جس نے اب تک مجھے مولوی صاحب مرحوم کے حالات لکھنے سے روکا۔ بہت کچھ لکھ لیا تھا، وہ پھاڑ ڈالا

کہ کہیں انجن چھوڑ گھسیٹن ہی نہ پڑ جاؤں"۔

(۲) "انشاء اللہ تعالیٰ واقعات کے اظہار میں مجھ سے غلطی نہ ہوگی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ بعض نام بھول جانے کی وجہ سے چھوڑ جاؤں یا غلط لکھ جاؤں، اب رہا سچ یا جھوٹ، تو اس کی مجھے پروا نہیں۔ میں اپنے محترم استاد کے حالات لکھ رہا ہوں۔ اگر سچ ہیں تو میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ اگر جھوٹ ہیں تو وہ خود میدانِ حشر میں سود در سود لگا کر تاوان وصول کر لیں گے"۔

(۳) "ہمارے تھرڈ ماسٹر صاحب بڑے تگڑے تھے کُشتی بھی جانتے تھے ان کا مقابلہ ایک بڑی لمبی ڈاڑھی والے ماسٹر سے ہو گیا۔ خیر انھوں نے بے چارے کو پٹخنے دیے سو دیے، اس اپاڈکی میں اس کی آدھی ڈاڑھی بھی نوچ لائے، اور یہ ڈاڑھی مالِ غنیمت کا ایک جزو قرار پائی"۔

مزاح نگاری میں میرزا فرحت اللہ بیگ کی کامیابی کی بڑی ضامن ان کی دل کش زبان ہے۔ صاف ستھری اور بامحاورہ زبان لکھنے پر انھیں بڑی قدرت حاصل تھی۔ جس طرح وہ خیال اور اظہارِ خیال کے سانچوں کو بگاڑ کر مزاح پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے، اسی طرح وہ زبان کو نہ تو خواہ مخواہ بناتے ہیں اور نہ بگاڑتے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تحریروں میں ایسی مضحک، رکیک اور مکروہ صورتیں نہیں پیدا ہونے پاتیں، جو بازاری مذاق کی سرحد میں آجائیں اور جو ممکن ہے کہ وقتی تمسخر کا ذریعہ ہوں، لیکن پائدار ادب کے عناصر سے خالی ہوتی ہیں۔ میرزا صاحب کے قلم سے سلاست اور وضاحت کا دامن بھی بہت کم چھوٹنے پاتا ہے۔ اور یہ تحریر کی بڑی خوبی ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا میرزا صاحب کی زبان اکثر بول چال کی زبان اور صاف ستھری اور میٹھی زبان ہوتی ہے۔ بعض وقت ان کے موضوع اتنے دلچسپ نہیں ہوتے جتنی دل کش ان کی زبان اور ان کا اندازِ بیان ہوتا ہے، اسی لیے ایسے مضامین کو بھی جب قاری شروع کرتا ہے تو ان کو ختم کرنے تک کتاب ہاتھ سے نہیں چھوٹ سکتی۔ یہ تحریر ایک طرف تو موٹے موٹے لغات اور نامانوس الفاظ سے پاک ہوتی ہے تو دوسری طرف خیال کی

گنجلک کا بھی اس میں نام ونشان نظر نہیں آتا کہیں کہیں بول چال کے الفاظ بھی وہ ادبی زبان میں خوبی سے کھپا جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ لکیر کے فقیر علما اس طرح کے الفاظ پر ناک بھوں چڑھائیں، لیکن میرزا فرحت اللہ بیگ کو اس کی کبھی پروا نہیں ہوئی، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس سے تحریر میں حقیقت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ میرزا کے سارے مضامین ادبی خوبی کے ایک معیار پر واقع ہوئے ہیں، خاص طور پر درمیانی زمانے میں، جب انھیں ملک بھر میں قبولیت عام حاصل ہونے لگی تھی، تو خواہ شہرت کی خاطر ہو یا پیسہ کمانے کی خواہش سے اور خواہ لکھنے کے شوق کے باعث ہو یا دوست احباب اور مدیران جراید کے تقاضے کی بنا پر، ادھورے سونچے ہوئے اور ادھورے لکھے ہوئے مضامین کا ایک تانتا سا بندھ گیا تھا۔ اسی زمانے میں میرزا صاحب کے قلم سے ایسے مضامین بھی نکلے، جن میں زبان کی صفائی اور سلاست تو موجود ہے جو ان کی تحریر کا مخصوص وصف تھا، لیکن ان میں طبیعت کی وہ روانی اور اپج نظر نہیں آتی، جو میرزا صاحب کے اچھے مضامین کا خاصہ ہے۔ اسی لیے انھیں بلند پایہ ادبی پاروں میں جگہ نہیں مل سکتی، کیونکہ وقتی دلچسپی کے علاوہ، ان میں نہ کوئی پایدار خیال ہوتا ہے اور نہ کوئی باقی رہنے والی ادبی خوبی۔ اسی طرح کے مضامین میں کبھی کبھی ویسی ٹھوس ٹھاس بھی نظر آتی ہے، جو دوسرے درجے کے مزاح نگاروں کی تحریر کی خصوصیت ہے۔ غالباً انھیں مضامین کو پیش نظر رکھتے ہوئے میرزا صاحب کے ایک دوست نے کہا تھا "فرحت کو تحریر کا ہیضہ ہو گیا ہے"۔

لیکن اس بات سے میرزا کی ادبی اہمیت اس لیے نہیں گھٹ سکتی کہ یہ عیب صرف انھیں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ سارے مقبول لکھنے والوں میں کم و بیش یہ بات پائی جاتی ہے۔ یہ بھی نہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ چیز محض اردو زبان کے لکھنے والوں کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہے، بلکہ دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی ایسی صورتوں کی کمی نہیں ہے۔ اسی لیے ڈزرائیلی نے ایک موقع پر لکھا تھا کہ سب سے اچھے لکھنے والے مصنف ہی، سب سے برا بھی لکھ جاتے ہیں۔

ان مضامین کے قطع نظر، عام طور پر میرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کے مضامین میں خاصی تعداد ایسے مضامین کی ہے، جو اردو ادب میں جگہ پیدا کر لیں گے اور ہر زمانے میں لطف کے ساتھ

پڑھے جائیں گے۔ میرزا ے مرحوم کے قدردانوں اور احباب کی یہ ایک شایستہ ادبی خدمت ہوگی، اگر وہ اردو کے صاحب ذوق نقّادوں کے مشورے سے، میرزا صاحب کے مضامین کے اتنے سارے مجموعوں میں سے، ایسے مضامین چھانٹ کر سلیقے کے ساتھ شایع کریں، جو مذاق اور زمانے کی تبدیلی کے اثر سے اونچے ہیں۔ ایسے مضامین کے ایک سے زیادہ مجموعے شایع ہوسکیں گے۔ فی الحال مضامین کے جو مجموعے بازاروں میں ملتے ہیں وہ اتنے غلط سلط چھپے ہیں، کہ ان سے زبان اردو کی جو بیش بہا خدمت لی جاسکتی تھی، اس میں دقّتیں واقع ہوتی ہیں۔ میرزا صاحب کی لفظیات کا خزانہ کافی وسیع ہے اور چونکہ وہ بولی کے الفاظ بھی استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے، اس لیے ان کے مضامین میں ایسے بہت سے الفاظ مل جائیں گے جو مستند لغات میں ابھی جگہ نہیں پا سکے ہیں۔ اردو زبان کا یہ ابھی نمو پزیری کا زمانہ ہے، اس طرح کے الفاظ کے اضافے سے اس کی لفظیات کا دامن وسیع ہو سکتا ہے۔

میرزا فرحت اللہ بیگ کی ادبی کامیابی اور شہرت میں خاصا حصّہ ان کے موضوعات کا بھی ہے۔ اس میں شک نہیں، کہ میرزا صاحب ان ادیبوں میں سے نہیں تھے، جن کی کامیابی کا انحصار زیادہ تر بخت و اتّفاق سے ایک یا چند ایسے موضوعات کے ہاتھ لگ جانے پر ہوتا ہے، جو کوئی اہمیّت، ندرت یا دل کشی اپنے اندر رکھتے ہیں۔ گویا ان کی شہرت، ان کے ذاتی اوصاف سے زیادہ ان کے موضوعات کی مرہونِ منّت ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف میرزا صاحب کا شمار ایسے ادیبوں میں ہے، جن کی قابلیت اپنے اظہار کے لیے خاص موضوع تک محدود نہیں ہوتی۔ وہ جس موضوع کو ہاتھ لگاتے ہیں اُسے اپنی ذاتی قابلیت، لطف گویائی اور حسن بیان سے گلزار کی طرح کھلا دیتے ہیں۔ چنانچہ میرزا صاحب کے مضامین کی فہرست پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات بہ خوبی واضح ہو جائے گی کہ وہ نہ کسی مخصوص قسم کے موضوعات کے رہین ہیں اور نہ ان کی طبیعت کو ہم کسی موضوع میں بند پاتے ہیں۔ ان کے پاس ٹھیٹ ادبی موضوعات سے لے کر سماجی، سیاسی، قانونی، تاریخی، سوانح اور خیالی غرض سبھی طرح کے موضوع استعمال ہوئے ہیں اور ہر موضوع پر ان کی تحریر یکساں دلچسپ دکھائی دیتی ہے۔ یہ درحقیقت میرزا صاحب کی ہمہ گیر طبیعت اور وسیع دلچسپیوں کا نتیجہ تھا

ان کی ادبی سوانح عمریاں بھی ویسی ہی دلچسپ ہیں جیسے کہ ان کے خیالی مضامین یا گھریلو زندگی کے مرقعے۔ یہ درست ہے کہ بعض مخصوص موضوعات کی پیش کشی میں وہ بڑی ندرت سے کام لیتے ہیں۔ مزاحیہ حلیہ اور خاکا نگاری میں میرزا صاحب کو خاص ملکہ حاصل تھا ان کے بعض بہترین ادبی پارے یہی ہیں۔ اس سلسلۂ مضامین کا آغاز انھوں نے ڈپٹی نذیر احمد سے کیا اور یہ مختصر سا مضمون، نذیر احمد کو سمجھنے اور سمجھانے میں شاید ایک بسیط سوانح حیات سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس مضمون میں سنجیدگی اور مزاح کا ایسا متوازن امتزاج ملتا ہے کہ اس کی مثال اردو ادب میں کم نظر آئے گی۔ اسی لیے یہ اردو ادب کے شہ پاروں میں شمار ہونے کا مستحق ہے۔ دلّی کا یادگار مشاعرہ اور چند دوسرے اسی قبیل کے مضامین، دراصل میرزا فرحت اللہ بیگ کی شہرت اور عظمت کے سنگِ بنیاد ہیں۔ میرزا صاحب کی ادبی جدّوجہد بعد میں زیادہ وسیع ہو گئی تھی۔ چنانچہ انھوں نے ڈراما پر بھی طبع آزمائی کی، تحقیقی مضامین بھی لکھے اور شاعری بھی کی۔ شاعری میں تو خیر انھیں کوئی بلند پایہ حاصل نہ ہو سکا، لیکن ڈراما میں انھیں جلد شہرت حاصل ہو جاتی، بشرطیکہ وہ اس صنف پر زیادہ توجہ کر سکتے۔ میرزا صاحب کے تحقیقی مضامین خاص پایے کے ہیں۔ خواجہ بدرالدین خواجہ امان پر جو مضمون لکھا ہے، اس میں نہ صرف دادِ تحقیق دی ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس اہم شخصیت کی باز تخلیق کی ہے۔ خواجہ امان اب سے پہلے کی شایستگی کا نمونا تھے، میرزا صاحب نے خواجہ امان پر مضمون کیا لکھا ہے، اس دور کی تہذیب اور شایستگی کے چلتے پھرتے اور بولتے چالتے نمونے سامنے لا کر رکھ دیے ہیں۔ جس طرح انھوں نے اپنے بزرگ خواجہ بدرالدین عرف خواجہ امان کو ادبی زندگی بخشی اسی طرح اپنے استاد ڈپٹی نذیر احمد کی شخصیت کو بھی اردو ادب میں زندہ جاوید کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ میرزا صاحب کے معجز نگار قلم نے دہلی کے آخری دور کے سربرآوردہ شعرا غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، شیفتہؔ، آزردہؔ صہبائیؔ اور داغؔ کو بھی ہمارے لیے چلتے پھرتے انسان بنا دیا ہے۔ ان شخصیتوں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جائے گا اور خشک مغز نقّاد بال کی کھال کھینچتے رہیں، لیکن میرزا فرحت اللہ بیگ کے قلم نے ان شخصیتوں کی جو جیتی جاگتی تصویریں کھینچی ہیں، وہ اردو ادب

میں بے مثل رہیں گی۔ مولانا محمد حسین آزاد کی تحریر بھی دل کش ہوتی ہے اور جیساکہ میرزا فرحت اللہ بیگ نے ایک مقام پر اعتراف کیا ہے، انھیں شعرا کی محفل جمانے کا خیال آزاد ہی سے ملا، لیکن میرزا فرحت اللہ بیگ کی تصویروں کے مقابلے میں آزاد کی تصویریں خارجی بیان سے مزین کی ہوئی اور باہر سے کھینچی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

میرزا فرحت اللہ بیگ کے یہ کارنامے اردو ادب میں زندہ رہنے والے ہیں اور ان کے ساتھ خود میرزا صاحب کا نام بھی۔

عبدالقادر سروری

دِلّی کا آخری اَدِیب

میرزا فرحت اللہ بیگ کا سب سے پہلا مضمون میں نے لکھنؤ کے رسالے الناظر میں پڑھا تھا۔ یہ مئی ۱۹۲۷ء کا ذکر ہے۔ رسالہ الناظر میں ان کا مشہور مضمون "دلّی کا آخری مشاعرہ" چھپا تھا! ور مجھے اب تک یاد ہے کہ اس مضمون کی پہلی قسط پڑھنے کے بعد دوسری قسط کا مجھے کس قدر بے چینی سے انتظار تھا۔

اس کے بعد میرزا صاحب کے اور بھی مضمون میں نے پڑھے۔ لیکن میرے ذہن میں ان کا تصوّر ہمیشہ دلّی کا آخری مشاعرہ لکھنے والے ادیب کی حیثیت سے ہی رہا۔ میرا خیال ہے کہ دلچسپی کے اعتبار سے ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کا درجہ بھی بہت اونچا ہے۔ مجھے یہ مضمون اس لیے بھی پسند آیا کہ ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے سراج الدین احمد میرے ہم جماعت تھے اور میں ان کے ساتھ اکثر ڈپٹی صاحب کے بتاشوں کی گلی والے مکان میں آیا جایا کرتا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ داستان کا لطف بڑھانے کے لیے انھوں نے اپنے بیان میں کسی حد تک مبالغے سے بھی کام لیا ہو۔ مگر میں ایسے لطیف مبالغے کو ایک ادیب کے لیے جائز سمجھتا ہوں۔ جس طرح مصوّر کو اپنی تصویر کے رنگوں میں ایک حد تک مبالغے کی اجازت ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک ادیب اور انشا پرداز کو بھی حق حاصل ہے کہ مبالغے کی رنگ آمیزی سے اپنے بیان کو رنگین بنالے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ہاں مکانوں اور کتابوں کا حساب کتاب لکھنے پر ایک بڈھے منشی صاحب ملازم تھے۔ غالباً انھوں نے اپنی جوانی میں ڈپٹی صاحب کو دیکھا تھا۔ ایک مرتبہ باتوں باتوں میں ان سے مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضمون کا ذکر آگیا تو بولے واقعی فرحت صاحب نے ڈپٹی صاحب کی تصویر کھینچ دی ہے۔

میرزا فرحت اللہ بیگ سے پہلی دفعہ میری ملاقات ماہ دسمبر ۱۹۳۸ء میں ہوئی۔ اگرچہ خط و کتابت ان سے ۱۹۳۷ء میں شروع ہو چکی تھی۔ اُن دنوں میں دون اسکول دیہ دون میں استاد تھا اور ہائی اسکول کے طلبا کے لیے اردو کا ایک نصاب تیار کر رہا تھا۔ میری میرزا صاحب سے بالکل بھی واقفیت نہ تھی لیکن ان کے مضمون پڑھ کر اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ یہ دلّی پر جان دیتے ہیں۔ چنانچہ اسی تقریب سے میں نے انھیں خط لکھا اور اپنے نصاب میں میرزا صاحب کے ایک مضمون کو شامل کرنے کی اجازت چاہی۔ چند روز کے بعد میرے خط کا حیدرآباد سے جواب آگیا۔ اس خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ مردِ غازی پر مالِ غنیمت حلال ہے۔ تم شوق سے میرے مضمون کو اپنے انتخاب میں شامل کر لو۔

نومبر ۱۹۳۸ء میں دون اسکول میں سالانہ جلسے کے موقعے پر میں نے دلّی کے آخری مشاعرے کا ایک سین اسٹیج پر پیش کیا اور اس کی بھی باقاعدہ اجازت میرزا صاحب سے مانگی۔ میرزا صاحب نے صرف اجازت ہی نہیں دی بلکہ اسٹیج کے متعلّق چند کارآمد مشورے بھی لکھ کر بھیجے۔ جن سے میرا کام بہت آسان ہو گیا۔

دسمبر ۱۹۳۸ء میں کرسمس کے موقعے پر میں دلّی آیا۔ اُنہی دنوں میرزا صاحب بھی دلّی آئے ہوئے تھے۔ اس بات کی خبر مجھے لالہ لاڈلی پرشاد صاحب رئیس دہلی کی زبانی ہوئی میں نے میرزا صاحب سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا اور شاید یہ بات لالہ صاحب نے میرزا صاحب تک پہنچا دی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اُسی دوران میں میرے عزیز دوست بھارت چند کھنہ بھی دلّی آئے ہوئے تھے اور اب حیدرآباد دکن واپس جا رہے تھے۔ خدا جانے میرزا صاحب تک یہ خبر کیسے پہنچ گئی کہ میں حیدرآباد جا رہا ہوں۔ چنانچہ یہ دلّی کے ریلوے جنکشن پر تشریف لے آئے۔ میں کھنہ کو رخصت کرنے اسٹیشن تک آیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک بزرگ حیدرآبادی وضع کی شیروانی پہنے پلیٹ فارم پر اِدھر اُدھر چکّر لگا رہے ہیں۔ میں سمجھا کوئی صاحب اسی ٹرین سے جا رہے ہوں گے۔ ان کے ساتھ ایک دلّی کے صاحبزادے بھی تھے کہ جنھیں میں خوب جانتا تھا۔ بار بار میرا ان کا آمنا سامنا ہوا مگر انھیں میں پہچان نہیں سکا۔ ایک دفعہ جب یہ بزرگ میرے قریب سے گزرے تو میں نے اِن کو یہ کہتے سنا۔ اچھا یہ ہیں آغا اشرف

چلو دیکھ لیا اِن کو۔ بس اب چلو۔ جیسے مجھے کسی غیبی آواز نے خبر دی۔ میں نے فوراً پوچھا آپ میرزا فرحت اللہ بیگ تو نہیں ہیں، پھر تو میں ان سے لپٹ گیا۔ جن دوست کو میں ٹرین پر رخصت کرنے آیا تھا، خدا جانے ان کا کیا حشر ہوا۔ مگر میں تو میرزا صاحب کے ساتھ ایسا چپکا کہ رات کے نو بجے تک باتیں ہوتی رہیں۔

(۲)

ریلوے اسٹیشن کے پاس ہی کمپنی باغ میں ایک کلب تھا۔ یہ مجھے اپنے ساتھ وہاں لے گئے۔ کلب میں ان کے ایک دوست بلیرڈ کھیل رہے تھے۔ ہم دونو کرسیوں پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ مگر باتوں باتوں میں میرزا صاحب اپنے دوست کو کھیل کے اشارے بھی بتاتے جاتے تھے۔ اس روز یہ خود تو بلیرڈ نہیں کھیلے مگر جس انداز سے یہ کھیل کے متعلق ہدایتیں دے رہے تھے اس سے مجھے یہ خیال ضرور ہوا کہ میرزا صاحب کو کھیل سے خوب واقفیت تھی۔

ان کی باتوں میں جوانوں کا جوش تھا۔ بچوں کی طرح ہر بات میں دلچسپی لیتے تھے وطن سے باہر رہنے والوں کے دل میں ہمیشہ وطن کی محبت زیادہ ہوتی ہے۔ مگر میرزا صاحب کو تو دلّی سے محبت نہیں عشق تھا۔ ہر ہر قدم پر انھیں پرانی دلّی اور اُس پرانی دلّی کے رہنے والے یاد آجاتے تھے۔

کئی برس ہوئے میں نے میرزا صاحب کا ایک مضمون پڑھا تھا جس میں انھوں نے پرانی دلّی کا موجودہ زمانے کی دلّی سے مقابلا کیا تھا۔ جامع مسجد، چاوڑی بازار، چاندنی چوک اور قطب صاحب میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کا ذکر اس مضمون میں میرزا صاحب نے بہت چبھتے ہوئے لفظوں میں کیا تھا۔ انھوں نے آج سے پچاس سال پہلے کی دلّی دیکھی تھی۔ اس وقت کی دلّی میں اور آج کی دلّی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ تو پچاس برس کا فرق ہے میرے دیکھتے دیکھتے گزشتہ بیس پچیس برس میں دلّی میں عجیب و غریب تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ ایسی تبدیلیاں کہ ان کے خیال سے دل کو رنج ہوتا ہے۔

آج سے بیس برس پہلے جامع مسجد اور مٹیا محل کے درمیان جب ٹریم ٹھہرتی تھی تو فوراً ایک اندھا فقیر لکڑی ٹیکتا ہوا آجاتا تھا اور خواجہ میر درد کی یہ غزل بہت سوز و گداز

سے پڑھتا تھا۔

کس لیے آئے تھے ہم کیا کر چلے

ابھی چند ہفتے ہوئے کہ میں نئی دہلی کے ایک سینما سے تماشا دیکھ کر نکلا تو سامنے ہی ایک اندھا فقیر زور زور سے چلا رہا تھا۔

بلائنڈ والا صاحب سلام بولتا

اس عجیب و غریب صدا کو سنتے ہی مجھے میرزا فرحت اللہ بیگ یاد آ گئے۔ اگر میرزا صاحب اس فقیر کی آواز سن لیتے تو شاید غصے سے سر پیٹ لیتے۔ نہ جانے کیوں اب تک میرا دل یہی کہتا ہے کہ نئی دہلی کا یہ اندھا فقیر اُسی جامع مسجد والے فقیر کا لڑکا ہے۔

دسمبر ۱۹۳۸ء کے آخری ہفتے میں میرزا صاحب سے میری کئی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ انہی دنوں مشن کالج دہلی میں طلبائے قدیم کا ایک جلسہ ہو رہا تھا۔ اس میں مَیں بھی میرزا صاحب کے ساتھ گیا۔ وہاں سی۔ ایف اینڈریوز بھی تشریف رکھتے تھے۔ ان سے بہت محبت سے ملے اور یہ دونو بہت دیر تک پرانے دوستوں کا ذکر کرتے رہے۔ رات کو کالج میں ڈنر تھا، ڈنر کے بعد احباب کی فرمایش پر میرزا صاحب نے بھی تقریر کی۔ میرا خیال ہے کہ جو تازگی، سلاست، اور ظرافت ان کے مضامین میں پائی جاتی ہے اس سے کہیں زیادہ لطف ان کی تقریر میں مجھے آیا۔ بہت دیر تک یہ مشن کالج میں اپنے طالب علمی کے زمانے کا ذکر کرتے رہے اور ہر دلچسپ واقعے کو یہ اس خوبی سے ادا کرتے تھے کہ اس کی ہو بہو تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی تھی۔ جلسے کے دوران میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ طالب علمی کے زمانے میں میرزا صاحب کرکٹ اور فٹبال کے بہت عمدہ کھلاڑی تھے! ور ہر سال کالج میں شکسپیر کے ڈرامے اسٹیج کرنے میں سب سے پیش پیش رہتے تھے۔ چنانچہ سی۔ ایف اینڈریوز نے ان کے ایکٹنگ کی بہت تعریف کی۔

انہی دنوں جوشؔ ملیح آبادی بھی دلّی آئے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے مکان پر میرزا صاحب اور جوشؔ کو چائے کی دعوت دی۔ ان دنوں میں اپنے قدیم خاندانی مکان میں کشمیری دروازے رہا کرتا تھا۔ میرزا صاحب کو جب بلا وا دینے گیا تو احتیاطاً مکان تک

پہنچنے کا نقشہ بھی بیان کرنے لگا۔ کیونکہ میرا مکان بہت سی گلیوں کے اندر تھا۔ اس پر یہ بہت بگڑے اور کہا کہ دلّی کی کون سی گلی ایسی ہے کہ جس کا راستہ مجھے نہیں معلوم۔ میاں میں دلّی والا ہوں اور دلّی کے ہر گلی کوچے سے واقف ہوں۔ چنانچہ مقررہ وقت پر میرزا صاحب میرے مکان پر پہنچ گئے۔ اس میں لطیفہ یہ ہے کہ اس موقعے پر میں نے خواجہ حسن نظامی، جوش، حکیم آزاد انصاری مرحوم اور چند دوسرے دوستوں کو بھی بلایا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کو راستہ ڈھونڈنے میں دیر لگی، مگر میرزا صاحب ٹھیک وقت پر آن پہنچے۔

اس روز کی محفل میں پہلی مرتبہ مجھے معلوم ہوا کہ میرزا صاحب شعر بھی کہتے ہیں چنانچہ حکیم آزاد انصاری اور جوش کے بعد انھوں نے اپنا کلام سنایا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ انھوں نے جمنا پر ایک نظم سنائی تھی اور اس نظم کے ہر ایک شعر کو سب نے بار بار پڑھوا کر سنا تھا۔ ہر شعر یہ خاص ترنّم سے پڑھتے تھے اور نظم اگرچہ طویل تھی مگر انھیں سب شعر زبانی یاد تھے۔

میرزا صاحب سے میری آخری ملاقات ۳۱ر دسمبر ۱۹۳۸ء کی رات کو ہوئی اس شب دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نئے سال کی خوشی میں اور پرانے سال کو الوداع کہنے کے لیے ایک پروگرام براڈ کاسٹ ہوا تھا، یہ پروگرام میرزا صاحب نے مکالمے کی شکل میں لکھا تھا۔ ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء کا آپس میں تعارف ریڈیو کے لیے ایک نئی چیز تھی۔ میرزا صاحب ۱۹۳۸ء یعنی قدیم سال تھے اور میں نئے سال (۱۹۳۹ء) کا پارٹ ادا کر رہا تھا۔ اس مکالمے میں انھوں نے واقعاتِ حاضرہ پر جس انداز سے تبصرہ کیا تھا، یہ ریڈیو کی تاریخ میں ایک نیا باب تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ان کا یہ پروگرام بے حد مقبول ہوا اور اس کے چند روز بعد میں ناگپور گیا تو وہاں بہت سے حضرات ایسے ملے کہ جنھوں نے یہ پروگرام سنا تھا اور مزے لے لے کر اس کا ذکر کر رہے تھے۔

اس کے چند ہفتے بعد میرا تقرر لندن یونیورسٹی میں اردو کے لکچرار کی حیثیت سے ہو گیا اور لندن جانے سے پہلے میں نے میرزا صاحب کو لکھا کہ آپ نے مکالمے میں مجھے ۱۹۳۹ء بنایا تھا اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ بات مجھے راس آگئی۔

لندن کے دورانِ قیام میں ان کے چھوٹے صاحبزادے میرزا رفعت اللہ بیگ سے ملاقات ہوئی جو اُن دنوں ویلز میں ڈاکٹری کی تعلیم پا رہے تھے۔ ان کے ذریعے میرزا صاحب

کی خیریت کا حال اکثر معلوم ہوتا رہتا تھا۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں ایک کمیٹی کے سلسلے میں مسز سروجنی نائیڈو کے ہاں ڈاکٹر غلام یزدانی سے میری ملاقات ہوئی۔ میرزا فرحت اللہ بیگ نے ڈپٹی نذیر احمد کے مضمون میں ڈاکٹر غلام یزدانی کا دانی میاں کے نام سے بار بار ذکر کیا ہے اور اسی وجہ سے میں ان سے خوب واقف تھا۔ ڈاکٹر یزدانی سے سب سے پہلے میں نے میرزا صاحب کی خیریت پوچھی اس واقعے کے چھے مہینے بعد شملے میں مجھے انہی ڈاکٹر یزدانی کے خط سے معلوم ہوا کہ دلّی کے آخری ادیب ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔

دلّی کی خاک سے جو محبّت میرزا فرحت اللہ بیگ کو تھی اُس کی جھلک ان کے مضامین میں ملتی ہے۔ مگر میں نے اس محبّت کا اندازہ ان کی گفتگو سے بھی کیا تھا۔ اِسی محبت نے میرزا صاحب کے قلم سے دلّی کے تاریخی مشاعرے جیسا مضمون لکھوایا۔ میرزا فرحت اللہ بیگ نے بیسوں مضمون لکھے اور ان میں سے ہر مضمون ان کی طرزِ تحریر کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اگر یہ دلّی کے تاریخی مشاعرے کے سوا کوئی اور مضمون نہ بھی لکھتے تب بھی ان کا درجہ اردو ادب کی تاریخ میں ویسا ہی قایم رہتا۔

آغا محمد اشرف

میرزا فرحت اللہ بیگ

بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں دنیائے ادب نے کروٹ بدلی۔ مغربی ادب ایشیائی زبانوں پر اثر انداز ہونے لگا۔ خیالات اور جذبات تبدیل ہوئے۔ نئے نئے رجحانات پیدا ہوئے اور ہمارے ادب کے لیے ترقی کی راہیں کھلنے لگیں۔ میرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی کے قلم نے اردو ادب میں مزاح کا صحیح عنصر شامل کیا۔ حق تو یہ ہے کہ اردو زبان اس وقت تک مزاح کی صحیح چاشنی سے نا آشنا تھی۔ زبان کی پرورش کا ماحول ہی کچھ ایسا تھا کہ اس میں مزاح کا عنصر مفقود رہا۔ کیونکہ اس وقت خارجی حالات کی شگفتگی اور انفرادی رجائیت دونوں ناپید تھیں۔ لوگ شاعری کے دل دادہ نہیں پجاری تھے۔ شعر کہنا ایک قابلِ رشک فن تھا، بے ضرورت پیشہ نہ تھا شاہی درباروں میں شعرا کی بن آئی تھی۔ نواب اور امرا شاعروں کی قدر کرتے اور شعرا ان کی توصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے۔ کبھی کبھار جو ان کی آپس میں ٹھن جاتی تو ایک چلاتا "لا تو غنچہ میرا قلمدان"۔ بس پھر کیا تھا، ایک قیامت برپا ہو جاتی۔ پھبتیاں کہی جاتیں، بے نقط سنائی جاتیں اور کچھ اسی طرح سے دل کا غبار ہجو یہ شاعری کی صورت اختیار کر جاتا۔ اس میں اگر کوئی مزاح کا عنصر تھا تو اس قدر بھدا، تیز اور ناشایستا کہ چڑچڑاپن سے کچھ ہی اِدھر رہ جاتا۔

مغربی ادب کے زیرِ اثر لوگوں کے ادبی مذاق کے ساتھ ساتھ مزاح کا درجہ بھی بلند ہو گیا دو ایک نے وہ وہ موتی ٹانکے کہ دیدنہ شنید۔ فرحت نئے مغربی مزاح سے بہت حد تک متاثر ہیں لیکن نئی تہذیب انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ پرانی باتیں رہ رہ کر یاد آتی ہیں۔ پرانی محفلوں کے متوالے، مٹتی ہوئی تہذیب کے دلدادہ، ان کی خالص دہلوی زبان بے شک ان کے لطیف مزاح کی جان ہے۔ ان کی کہانیوں کا پس منظر، پرانے گلی کوچے، پرانے بازار، پرانے مکانات،

اور دلّی کا دل اسے آپ چاندنی چوک کہہ لیجیے یا چاوڑی۔

"میرا اتنا کہنا تھا کہ بپھر گئے، ہاتھ پکڑ کر جھٹک دیا۔" آ بیٹھ، میں تجھے تیری دلّی کی تعریف سناؤں، تجھے معلوم بھی ہے، کہ دلّی کا دل کیا تھا۔" میں نے کہا "چاندنی چوک"۔ کہنے لگے "ہٹ تیرے جھوٹے کی، شرماتا کیوں ہے، چاوڑی کیوں نہیں کہتا۔"

ان کے کردار یا تو کوئی میرو میرزا ہیں۔ وہی پرانا رنگ ڈھنگ، چوگوشیا ٹوپی، نیچی چولی کا انگرکھا، چوڑی دار پاجامہ اور بھر دہی سرخ ڈاڑھی، نوجوانوں کی مغربیت پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور بار بار کہہ اٹھتے ہیں کہ پہلے وقت نہ رہے۔ ان کے مجموعے میں سب سے پہلا مضمون "ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی"۔ میرزا صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی گھریلو زندگی، عادات، اطوار، طبیعت اور فطرت کا جو نقشا کھینچا ہے، اس میں کتنی مناسبت ہے۔ شوخی تحریر کہے دیتی ہے کہ لکھنے والے نے نذیر احمد کی زندگی کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور اپنے کردار کو خوب سمجھتا ہے۔ اُس نے جو لکھا ہے، اس کے اپنے دل کی آواز ہے۔ مولانا سلیم پانی پتی نے جو اس مضمون کو پڑھا تڑپ کر رہ گئے۔ اپنے شاگردوں کو بُری طرح سے کوسا۔" تم میں سے ایک بھی نہیں جو ہماری زندگی کو اس رنگ میں لکھ سکے۔ تف ہے تم پر"۔ حُسنِ اتفاق سے ایک مشاعرے کے سلسلے میں مولانا اور میرزا صاحب کی ملاقات بلکہ آمنا سامنا ہو گیا۔ مولانا خوب پہچانتے تھے اور میرزا بیچارے بالکل ناواقف۔ کسی تعارف کے بغیر ہی مولانا میرزا سے لپٹ گئے۔ میرزا جھنجلا ہی تو گئے۔ لیکن مجبور تھے اُس قوی ہیکل دیو کی آہنی گرفت کچھ ایسی نہ تھی کہ تڑپنے سے رہائی ہو جاتی۔ قہر درویش بجانِ درویش چپ سادھ لی اور سوچنے لگے کہ آخر یہ کون صاحب ہیں! اُدھر مولانا کا یہ عالم کہ بوسے پہ بوسہ داغے جا رہے ہیں۔

فرحت کی مزاح کی بنیاد واقعیت پر ہے۔ حالات خود بخود ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ انسان کے دل میں گدگدی سی چٹکیاں لینے لگتی ہے، وہ ایک دلچسپ واقعے کو اس رنگ میں بیان کرتے ہیں کہ ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ پڑھنے والے کے قہقہے اُن کی زبان کی چستی اور طرزِ بیان کی شگفتگی کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اپنی تحریر کے متعلق خود ان کی اپنی رائے ہے "نمک مرچ اس لیے لگانے کی ضرورت نہیں ہوئی کہ واقعات چٹ پٹے ہیں۔" میرزا نے پھبتیاں

نہیں کہیں، جان بوجھ کر ایسے حالات پیدا نہیں کیے کہ انسان قہقہے لگائے، میرزا کا مزاح سنجیدہ اور عالمانہ ہے۔ واقعات کی قدرتی پیداوار!

میرزا کی ایک اور خصوصیت تحریر میں تنوّع ہے۔ شروع میں ان کے مضامین کا پس منظر پُرانی دلّی اور پرانے لوگ رہا۔ میر و میرزا نئی تہذیب کے پرستاروں کو آڑے ہاتھوں لیتے رہے ان شہر والوں کو لو، لعنت ہے ان کی شکل پر۔ یہ دلّی والے ہیں، خدا کے لیے سچ کہنا کیا ان کو کوئی دلّی والا کہے گا۔ بال دیکھو تو جھاڑ جھنکاڑ، منہ دیکھو تو ہیجڑوں کا سا۔ لباس دیکھو سبحان اللہ نیچے قمیص ہے اوپر کرشٹانوں جیسا چھوٹا کوٹ۔ ٹانگوں میں دو تھیلے چڑھائے گٹ پٹ گٹ پٹ کرتے چلے آرہے ہیں۔ لیجیے یہ ہیں آپ کے دلّی والے اور تو اور کمبخت عورتوں نے بھی اپنی کچھ عجیب وضع بنالی ہے۔ انگیا کرتے اور ڈھیلے پائجامے تو غدر کے ساتھ گئے۔ چوڑی دار تنگ پائجامے اور کرتے دربار کے ساتھ رخصت ہوگئے۔ اب لباس کیا ہے؟ بس یہ سمجھ لو، کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا۔

آہستہ آہستہ پس منظر تبدیل ہو رہا ہے۔ شاید جس رخ زمانا پھرے، اُسی رُخ پھر جاؤ کے اصول پر عمل کرنے کی غرض سے۔ بہرحال اب تنگ گلی کوچوں کی بجائے صاف اور کشادہ سڑکیں ہیں۔ کردار زیادہ سمجھدار اور زمانا شناس ہیں کسی قدر انگریزی تمدّن سے واقف بھی، میرزا کے کردار کچہریوں میں جاتے ہیں۔ وکالت کرتے ہیں۔ مقدّمات لڑتے ہیں اور ہمیں پرانی باتیں بھلادینے پر مجبور کرتے ہیں" نواب صاحب کی ڈائری کے چند پراگندہ صفحات" میں انہی باتوں کا ذکر ہے۔ منظر بدلتا ہے۔ انگریز آئی۔ سی۔ ایس کا حسین بنگلا۔ صاحب بہادر کے بہرے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ دیکھیے کس شان سے سینے پر ہاتھ مار کر کہہ رہے ہیں "کمال ہمارا ہے کہ لیتے ہی نہیں لوٹتے ہیں، آنکھوں میں خاک جھونک کر لوٹتے ہیں، ڈنکے کی چوٹ لوٹتے ہیں اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ تڑا تڑ حساب دیتے ہیں کہ صاحب تو صاحب اجی میم صاحب کی بھی سٹی گم ہوجاتی ہے"۔ یہ تو تھی اپنے کمال کی تعریف اب انھیں سے چند راز کی باتیں بھی سن لیجیے فرماتے ہیں۔

"بعض صاحب بہادر اس ڈر سے کہ کہیں خانہ جنگی نہ ہو جائے۔ ہمارے ناز اٹھاتے ہیں اور بعض اس خیال سے کہ کہیں نشہ میں کوئی سرکاری راز منہ سے نہ نکل جائے ہماری مٹھی میں رہتے

ہیں اور ہمارا یہ نفع ہے کہ پہلا پیگ خالص پلا یا دوسرے میں آدھا پانی ملا دیا اور ہوتے ہوتے خالص پانی پر لا ڈالا" اب آپ بتائیے رازداری اچھی یا راز کا افسانا اچھا"

دیکھا آپ نے فرحت کی زبان اور مزاح کی کیا عظمت ہے۔ کچھ سال گزرنے کے بعد میرزا فرحت اپنے رنگ میں ایک عجیب تبدیلی محسوس کرتے ہیں۔ ان کے خیالات پر مغربی فلسفہ کسی حد تک اثرانداز ہو چکا ہے۔

بایں ہمہ فرحت کے دل میں دلّی کی پرانی محفلوں کی یاد پہلے کی طرح تازا ہے اور کبھی کبھی اس پر مایوسی اور افسردگی کا عالم چھا جاتا ہے۔ غور سے دیکھیے' ان کے ہر مضمون میں کہیں نہ کہیں غم و اندوہ کا عکس پڑ رہا ہے' لیکن وہ عکس اس قدر دھندلا اور نامعلوم سا ہے کہ ہم بتا نہیں سکتے کہاں ہے اور کہاں نہیں؟ البتّہ جب اُن کے تیز جذبات روکے سے نہیں رُکتے تو تحریر میں ایک حزین پہلو آن موجود ہوتا ہے۔ (امتحان کا دوسرا رُخ) میں ہیرو قانون کے امتحان کی تیاری کر رہا ہے۔ اس کی ناقابلِ بیان حالت پر رحم بھی آتا ہے اور ہنسی بھی۔ ماما کی ماری کے بقول وہ نہ دن کو دن سمجھتا ہے اور نہ رات کو رات۔ لگاتار محنت کیے جا رہا ہے۔ گھر میں کھانے تک کو نہیں ملتا آخر چھوٹی رضیہ کے گلے کا ایک لچھا اور پاؤں کی پازیب رہن رکھ دی جاتی ہے۔ ننھی منّی کو ماں یوں تسلی دیتی ہے کہ "بیٹی جب بھائی جان پاس ہو جائیں گے تو تجھے بہت سے پیسے اور زیور لا کر دیں گے۔"

رضیہ مُنہ بسور کر کہتی ہے "امّی اور اگر بھائی جان پاس نہ ہوئے تو" ماں اور بیٹے کے دلوں پر ایک دھکّا سا لگتا ہے۔ "نہ بیٹی ایسی باتیں تو نہیں مُنہ سے نکالا کرتے۔"

میرزا میں اپج کا مادّہ بدرجہ اتم موجود ہے لیکن بعض دفعہ وہ نئی چیز کی خاطر حقیقت نگاری کا دامن چھوڑ دیتے ہیں' آخر میں کہیں کہیں ان کی تحریر میں کچھ ناصحانہ اور اصلاحی پہلو بھی شامل ہو گیا لیکن یہ عمر کا تقاضا ہے۔

میرزا صاحب کے انداز اور اسلوب کے متعلق ایک عجیب بات یہ ہے کہ ان کی تحریر آنکھوں کی بجائے کانوں کو زیادہ متاثر کرتی ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں آپ دیکھ سکتے ہیں لیکن اس سے زیادہ آپ سن سکتے ہیں۔

یوں کہیے، ایک خوش گفتار انسان رات کے سناٹے میں محفل میں بیٹھا زندگی کے متعلق اپنے اور اوروں کے تاثرات کچھ اس انداز سے بیان کر رہا ہے کہ سننے والے وجد میں آ کر بے اختیار داد دے رہے ہیں۔ الفاظ آنکھوں کے سامنے گویا مناظر کو اصلی رنگ میں پیش کیے دیتے ہیں۔

"واہ میرزا صاحب واہ۔"

"لو بھئی میں چلا۔ رات بہت گزر چکی ہے۔"

"لوگ چلائے، میرزا صاحب، میرزا صاحب، ٹھیریے ٹھیریے۔"

وہ کہاں سننے والے۔ یہ جا وہ جا۔ دم بھر میں آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ محفل سونی پڑی ہے۔ ایک کونے سے میر صاحب نے نعرا لگایا" واہ میرزا کیسے دُم دبا کر بھاگے۔ چیتے جیسی سبک چال الّو جیسی متانت۔ شیر جیسی ہمت۔ نہ ہر کہ مُو بتراشد قلندری داند۔"

مولانا نے ایک سرد آہ بھری اور اپنی پگڑی سنبھالتے ہوئے نحیف آواز میں بولے "اور جو بھائی جان پاس نہ ہوئے تو۔"

الطاف گوہر

مرزا فرحت اللہ بیگ کی ادبی تحقیق

اردو میں ادبی تحقیق کی ابتدا محمد حسین آزاد نے کی تھی۔ اُن سے پہلے اردو شاعروں کے جو تذکرے زیادہ تر فارسی اور کچھ اردو میں لکھے گئے تھے اُن میں تحقیق سے زیادہ تنقید و تبصرہ اور انتخاب اشعار پر زور دیا جاتا تھا۔ خود شاعروں کے حالات اور ان کی شاعری کے پس منظر کی طرف کم توجہ کی جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آزاد سے پہلے کے اہلِ قلم کلام، یعنے جو کچھ لکھا گیا ہے اُسی کے پرکھنے اور اس سے لطف اٹھانے میں اتنے منہمک ہو جاتے تھے کہ جس نے لکھا ہے اس کی طرف منعطف ہونے کی زحمت گوارا نہ کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج ہم کو اپنے بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کے ضروری حالاتِ زندگی تو کجا اُن کی تاریخ پیدایش اور تاریخ وفات اور بعضوں کے نام ہی کے متعین کرنے میں طول طویل بحثیں کرنی پڑتی ہیں اور بڑی کدوکاوش کے بعد بھی ٹھیک ٹھیک معلومات کا پتا نہیں چل سکتا۔

آزاد پہلے ادیب تھے جنھوں نے مشاہیر شعرائے اردو کے حالات کچھ ایسی خوش اسلوبی سے مرتب کیے کہ ان شعرا کو ازسرِنو زندہ کر دیا۔ اگرچہ اُن میں سے بعض کو یہ دوسری زندگی شاید ایسی ملی ہے جو ان کی اصلی زندگی سے بالکل جدا تھی اور جیسا کہ میرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم نے اپنے ایک تحقیقی مضمون کی تمہید میں لکھا ہے ؎

> "بعض وقت قلم کا زور واقعات کا رخ اس طرح پھیر دیتا ہے کہ پڑھنے والا جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ مان لیتا ہے اور بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ ضرورت غلط واقعات کو تسلیم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

مولوی محمد حسین آزاد مرحوم کے زورِ قلم نے سید انشا کی ایک ایسی تصویر دلوں میں قایم کردی ہے کہ اب کوئی تاریخ اس کو نہیں مٹا سکتی۔ کسی صاحب نے اعتراض کیا تھا کہ جو واقعات انھوں نے سعادت یار خاں رنگین کی کتاب مجالس رنگین کے حوالے سے لکھے ہیں ان کا ذکر اس کتاب میں کہیں نہیں لیکن کسی نے بھی اس کی پروا نہیں کی۔ اور بیچارے معترض کو خاموشی اختیار کرنی پڑی۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ حکیم آغا جان عیش دہلوی کا حال لکھنے میں بھی آزاد مرحوم نے بعض اہم غلطیاں کی ہیں خواہ وہ عمداً ہوں یا سہواً تو بھلا میری کون سنے گا"

(مضامین فرحت حصۂ دوم صفحہ ۱۲۲)۔

لیکن محض اس عیب کی وجہ سے اردو ادب کی تحقیق میں آزاد کو جو فضیلت اور مرتبہ حاصل ہے اس میں کسی طرح کی کمی واقع نہیں ہو سکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے بعد اگرچہ بیسیوں اصحاب نے اس میدان میں قدم رکھا اور اس موضوع سے متعلق گراں قدر خدمات انجام دیں لیکن شبلی، حالی، عبدالحق، سلیمان ندوی اور رشید احمد صدیقی جیسے ادبی نقاد اور محقق بھی تحقیقی تخلیق کی اس نادر اور شگفتہ منزل تک نہ پہنچ سکے جو آزاد کی گزرگاہ تھی۔

آزاد کے بعد اگر کوئی اس منزل تک پہنچتا نظر آتا ہے تو وہ مرزا فرحت اللہ بیگ تھے۔ انھوں نے ازبس کہ اس راہ میں زیادہ بادیہ پیمائی نہیں کی اور اپنی مزاحیہ مضمون نگاری کے درمیانی وقفوں میں محض گلگشت کے طور پر ادبی تحقیق کے میدان میں نکل آئے ہیں لیکن اپنی جودتِ طبع و رعنائیٔ خیال اور خوش مزاجی و بیباکی کے باعث ایسے کارنامے چھوڑ گئے ہیں جو تحقیق کی حد سے آگے بڑھ کر ایک شائستہ ادبی تخلیق بن گئے ہیں۔

آزاد نے اپنی طرزِ ادا میں جو جدت اور عبارت میں جو ندرت بڑی محنت اور کاٹ چھانٹ کے بعد پیدا کی ہے فرحت کے یہاں بغیر کسی آورد کے موجود ہو گئی ہے۔ آزاد قلم سنبھال کر لکھتے تھے اور فرحت کا قلم بے تکلف لکھتا چلا جاتا ہے۔ شاید اسی بیباکی کی وجہ سے فرحت کی تحریروں میں وہ رنگا رنگی اور گہرائی پیدا نہ ہو سکی جو آزاد کی عبارتوں

میں جلوہ گر ہے لیکن فرحت فطرتاً رنگین واقع ہوئے تھے اس لیے ان کے مرقعوں میں ایک ایسا سادا بانکپن ہے جو تصنع اور آرائش سے بے نیاز ہے۔ بعض جگہ وہ خشک اور تحقیقی بات بھی ایسی شگفتگی اور آزادی سے بیان کر جاتے ہیں جو آزاد کے لیے دقت طلب تھی۔ فرحت کا قلم بعض موقعوں پر اتنا بے باک ہو جاتا تھا کہ بے لگامی کی سرحد تک پہنچ جاتا تھا۔ اور آزاد ایسی بے لگامی سے بچنے کے لیے بڑے بڑے جتن کرتے تھے۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں فرحت کی ادبی زندگی شگفتہ اور مزاحیہ مضمون نگاری سے شروع ہوئی تھی اور جب اُن کے یہ دلچسپ مضمون شایع ہو رہے تھے اس وقت کوئی یہ خیال بھی نہ کر سکتا تھا کہ یہ چلبلا انشاپرداز تحقیقی مضامین بھی لکھ سکے گا! ور خود فرحت مرحوم کا بھی ابتدا میں یہی خیال تھا۔ چنانچہ انھوں نے انعام اللہ خاں یقین پر مضمون لکھنا شروع کیا جو اُن کے کسی مجموعۂ مضامین میں شریک نہیں ہے بلکہ صرف دیوان یقین کے مقدمے کی صورت میں شایع ہوا تو اُس کے اوائل میں بطور معذرت یا بطور تعارف یہ جملے لکھے ہے

"بھلا مجھ کو دیکھو اور انعام اللہ خاں یقین کے دیوان کی تصحیح اور طبع کرانے کو دیکھو! اس کے لیے کتب خانے کی، وسعت نظر کی، علمیت کی، شاعری کی اور سب سے زیادہ فرصت کی ضرورت ہے۔ میرے پاس ان میں سے کوئی چیز نہیں۔ کچھ تھوڑی بہت کتابیں تھیں ان کو دیمک نے کھا کر برابر کر دیا۔ شاعری سرکاری نوکری کے نذر ہو گئی! اب رہی فرصت تو اس کا پوچھنا ہی کیا ہے۔ ملازمت اور فرصت دو متضاد لفظ ہیں۔" (مقدمۂ دیوان یقین)

(۲)

جہاں تک میں نے میرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کی تحریروں کی چھان بین کی ہے یقین پر ان کا یہ مضمون ہی ان کی ادبی تحقیق کا نقشِ اوّل نظر آتا ہے لیکن اس مضمون کو انھوں نے ایسی محنت اور تلاش و جستجو سے لکھا اور اس میں اتنے کامیاب

ہوئے کہ اس کی اشاعت کے بعد نہ صرف دوسروں کی بلکہ خود ان کی بھی آنکھیں کھل گئیں۔ یہ اردو ادب کی خوش قسمتی تھی کہ انھوں نے اپنی فطری صلاحیت اور مفید مواقع سے فائدہ اٹھانے کی خاطر بعد کو اس قسم کے کئی اور مضمون لکھے اور اس طرح اردو کے تحقیقی ادب میں اپنے لیے ایک ایسی جگہ حاصل کر لی جو اکثر پیشہ ور محققوں کے لیے بھی قابلِ رشک ہے۔

فرحت مرحوم کی ادبی تحقیق پر کچھ لکھنے کے سلسلے میں جب ان کے مضامین کے مجموعوں کا میں نے مطالعہ شروع کیا تو اس موضوع سے متعلق مضمونوں کے سوا بعض غیر متعلق مضمونوں کو بھی شروع سے آخر تک پڑھ جانا پڑا۔ ان کی تحریروں میں ایسا جادو ہے کہ جہاں کسی جملے یا لفظ پر نظر پڑی تو پھر مضمون ختم کرنے تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ مضمون اصل موضوع سے متعلق ہے بھی یا نہیں۔ غرض ایک مدّت تو محض اس مطالعے یا آموختے میں گزر گئی اور اصل موضوع کی طرف واپس آنے اور خیالات کو یکجا کرنے میں بڑی دقّت پیش آئی۔ ان کے جو مضمون علم و ادب سے تعلق رکھتے ہیں ان کی فہرست میں پہلے پہل حسب ذیل تیرا مضامین شامل ہونے کے قابل نظر آئے۔

۱۔ ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی	مطبوعہ حصّہ اول	صفحہ	۲
۲۔ ۱۲۶۱ھ میں دہلی کا ایک مشاعرہ	" " "	"	۱۰۳
۳۔ ایک وصیّت کی تعمیل	" " دوم	"	۱۱۲
۴۔ حکیم آغا جان عیش	" " "	"	۱۲۲
۵۔ خطبۂ صدارت مدراس	" " سوم	"	۴
۶۔ لالہ سری رام	" " "	"	۷۲
۷۔ اصلاحِ سخن	" " "	"	۱۵۹
۸۔ یادِ ایامِ عشرت فانی	" " "	"	۸۴
" (دوسری قسط)	" " چہارم	"	۳
۹۔ العظمت للّٰہ	" " "	"	۳۹
۱۰۔ خواجہ بدرالدین خاں اماں	" " "	"	۱۸۷

۱۱۔ حافظ عبدالرحمٰن خاں احسانؔ مطبوعہ حصۂ ششم صفحہ ۱۴۳

۱۲۔ نظیر اکبر آبادی " ہفتم " ۱۰۵

۱۳۔ انعام اللہ خاں یقینؔ " دیوان یقین " ۱

بعد میں غور کرنے پر اس فہرست میں سے آٹھ مضمونوں کو خارج کرنا پڑا۔ کیونکہ وہ صحیح معنوں میں ادبی تحقیق کی تعریف میں نہیں آتے۔ نذیر احمد، وحیدالدین سلیم، لالہ سری رام اور عظمت اللہ خاں پر فرحت نے بے تکلفی کے ساتھ اپنے ذاتی تأثرات قلمبند کیے تھے۔ یاد ایام عشرت فانی کی دونوں قسطوں میں انھوں نے اپنے اوائل عمر کی خودنوشت سوانح عمری ایک بے باکانہ انداز میں لکھی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی اور اقساط بھی ان کے غیر مطبوعہ مسودوں میں موجود ہوں گی۔ کیونکہ انھوں نے اپنے سوانح حیات مکمّل کر لینے کا کئی بار تذکرہ کیا تھا لیکن اس کی اشاعت میں اس لیے پس و پیش کرتے تھے کہ کہیں ان کے خلاف مقدّمے نہ دائر ہو جائیں۔ اصلاح سخن کے عنوان سے جو مضمون لکھا تھا وہ دراصل ایک ادبی تبصرہ ہے۔ "۱۲۶۱ھ میں دہلی کا مشاعرہ" ایک نادر ادبی تخلیق ہے۔ خطبۂ صدارت مدراس میں اردو زبان اور ادب پر اگرچہ ایک سرسری تبصرہ کیا ہے لیکن اس سے ان کی معلومات کی وسعت اور ہمہ گیری کا پتہ چلتا ہے۔ اس طرح جو باقی ماندہ مضمون ادبی تحقیق کے معیار پر پورے اترتے ہیں وہ میری حدّ علم تک صرف پانچ ہی ہیں یعنی

۱۔ انعام اللہ خاں یقینؔ ۹۸ صفحات

۲۔ حکیم آغا جان عیشؔ ۷۰ "

۳۔ خواجہ بدرالدین خاں امانؔ ۱۰۰ "

۴۔ حافظ عبدالرحمٰن خاں احسانؔ ۱۰۶ "

۵۔ نظیر اکبر آبادی ۱۶۶ "

لیکن یہ پانچ مضمون بھی اتنے طویل اور مبسوط ہیں کہ اگر ان کو ایک جگہ جمع کر کے شایع کیا جائے تو ساڑھے پانچ سو صفحات کی ایک ضخیم جلد تیار ہو جائیگی۔

فرحت مرحوم کے قلم کی بیباکی اور ذہن کی تراقی اردو انشاپردازوں میں اپنا نظیر

نہیں رکھتی لیکن یہ دونوں خصوصیتیں ایسی نہیں جو ادبی تحقیق کے میدان میں سدراہ ثابت ہو سکتی ہیں تحقیق کے لیے سوچ بچار، تلاش و جستجو اور صبر و استقلال کی ضرورت ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ من چلا اور بے چین مزاحیہ نگار یہاں بھی مرد میدان ثابت ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ انھیں اس میدان میں لے آنے اور آجانے کے بعد ان کے اس میں ثابت قدم رہنے میں، ڈاکٹر مولوی غلام یزدانی کا بڑا ہاتھ ہے۔ یوں تو فرحت مرحوم نے اپنے مضمونوں میں کئی جگہ اپنے اس رفیق شفیق کا ذکر کیا ہے اور بعض موقعوں پر تو وہ ایک ہمزاد کی طرح فرحت اللہ بیگ کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے ہیں لیکن جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے فرحت کے تحقیقی مضامین کا سبب تالیف بھی مولوی غلام یزدانی ہی ثابت ہوتے ہیں۔

مرزا الم نشرح کے اس ذوق تحقیق کا آغاز یوں ہوتا ہے۔ دیوان یقین کے مقدمے میں وہ لکھتے ہیں ؎

"اب دیکھیے کہ یہ سلسلہ چھڑا کیونکر۔ میں دیوان تاباں نواب سالار جنگ بہادر کے ہاں سے لاکر نقل کر رہا تھا اسی جلد میں دیوان یقین بھی تھا۔ کبھی کبھی اس پر بھی نظر پڑ جاتی تھی۔ خدا معلوم یہ شعر کیونکر یاد رہ گیا ؎

اپنے بندوں کو جلا کر خاک کرتے ہیں یقین

ان بتوں کی ضد سے ہو جاؤں مسلماں تو سہی

ایک دن یوں ہی بیٹھے بیٹھے یہ شعر میں نے غلام یزدانی صاحب کے سامنے پڑھا۔ ان کو بہت پسند آیا کہنے لگے "مرزا صاحب یہ شعر تو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ کلام میں بڑی شیرینی ہے۔ اس پر کچھ لکھ ڈالو۔" خبر نہیں کہ ان کا یہ کہنا اتنا کیوں اثر کر گیا کہ رات بھر اسی دھن میں لگا رہا کہ کب صبح ہو اور کب دیوان یقین جاکر لاؤں صبح ہوتے ہی نواب سالار جنگ بہادر کے پاس عرض کرائی کہ چند روز کے لیے دیوان یقین دید یجیے۔ نواب صاحب کو خدا اچھا رکھے۔ کچھ عجب علم دوست شخص واقع ہوئے ہیں! ایک چھوڑ

دو دو دیوان بھیج دیے"۔ (مقدمہ دیوان یقین صفحہ ۲)

فرحت کا ایک تحقیقی مضمون جس کی اہمیت پر میں آیندہ روشنی ڈال رہا ہوں، خواجہ بدرالدین خاں امان پر لکھا گیا تھا۔ اس کے سبب تالیف میں میرزا صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کو خود انہی کی زبان میں ملاحظہ فرمائیے تو آپ پر واضح ہو جائیگا کہ میں نے یزدانی صاحب کے سر جو سہرا باندھا ہے وہ ان کے سر پر سجتا ہے یا نہیں۔ میرزا صاحب فرماتے ہیں ؎

"یہ تو شاید آپ کو بھی معلوم ہوگا کہ تھوڑے دنوں سے میں شاعر ہو گیا ہوں اور شاعر بھی اس زور کا کہ غالب کی غزل پر غزل لکھتا ہوں۔ اسی جوش شاعری میں ایک واقعہ کا اظہار مقطع میں اس طرح کیا ہے ؎

میری رندانہ روش کو بہر اصلاحِ خیال

محتسب سے کم نہیں فرحت مرا دانی مجھے

یقین مانیے کہ اس شعر میں جو لکھا گیا ہے وہ صحیح اور بالکل صحیح ہے یہ میاں دانی خدا کے فضل سے ایسے نکتہ چیں واقع ہوے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ یہ مرض تو ان کو بچپن ہی سے تھا مگر اب اس میں ترقی ہو کر بہت کچھ پختگی آگئی ہے .... کئی برس کی بات ہے کہ میں کسی شاعر کے حالات رسالہ' اردو میں لکھ رہا تھا کہ میاں دانی آ پہنچے۔ کہنے لگے "کیا لکھ رہے ہو" میں نے کہا "لو سن لو" خیر بڑی دیر تک بیٹھے سنتے رہے۔ ان کی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر میرے پڑھنے کی وجہ سے اپنا جوش دبائے بیٹھے ہیں۔ جب میں نے پڑھنا ختم کیا تو فرمانے لگے "ارے بھئی میرزا خدا کی قسم تمھاری باتوں سے بہت ہی جی جلتا ہے ایرے غیروں کے حالات گھسیٹے چلے جاتے ہو اور گھر کے پیروں کو تیل ہی کا ملیدہ کھلاتے ہو"۔ میں نے کہا "یہ کیا" کہنے لگے "بندۂ خدا آخر یہ حضرت آپ کے کون ہیں جو دین و دنیا سے فراموش کر کے ان کے حالات جمع کرنے کے پیچھے پڑے ہوے ہو۔ اگر چہ لکھنا ہے تو اپنے دادا خواجہ امان مرحوم ہی پر کچھ لکھ ڈالو۔

ان شاعروں کے قصّوں سے تو سینکڑوں کتابیں بھری پڑی ہیں خدا معلوم یہ کیا مصیبت ہے کہ ہماری زبان کے نثر لکھنے والوں کے حالات کوئی نہیں لکھتا۔ غضب خدا کا کہ اردو کے ٹٹ پونجیے شاعروں کے حال میں تو صفحے کے صفحے کالے کر دیے جائیں اور خواجہ امان جیسے نثر نگار کا نام تک لوگ نہ جانیں۔ میاں ابھی اس زمانے کے بزرگ تمھارے گھر میں موجود ہیں ان سے پوچھ پاچھ کر تھوڑا بہت لکھ لو ورنہ تھوڑے دنوں میں یہ قصّے بھی ان لوگوں کے ساتھ رخصت ہو جائیں گے"۔ (مضامین فرحت حصّہ چہارم صفحہ ۱۸۸)

(۳)

انعام اللہ خاں یقینؔ پر راقم الحروف کا ایک مضمون اردو کے مشہور ماہ نامہ نگار بابت جون ۱۹۲۸ء میں شایع ہوا تھا جو برٹش میوزیم کے دیوان یقینؔ کے مطالعے کے بعد قلمبند کیا گیا تھا اور اس میں لکھا تھا کہ اس دور کے شعرا کے حالات و کلام عام طور پر دستیاب نہیں ہوتے اور ضرورت ہے کہ ان کو منظر عام پر لایا جائے۔ کچھ تو شاید یہ مضمون پڑھ کر اور کچھ مولوی عبدالحق صاحب کی تحریک پر فرحت مرحوم نے ۱۹۲۹ء میں میری واپسی یورپ کے چند ہی روز بعد ایک عنایت نامہ ارسال فرمایا جس میں لکھا تھا:۔

"آپ ولایت سے آئے اور مجھ سے نہیں ملے۔ کچھ تحفہ نہ ملتا تو خیالات ہی مل جاتے۔ پرسوں مولوی عبدالحق صاحب مجھ سے ملے تھے۔ انھوں نے آپ کے واپس آنے کا ذکر کیا اور یہ بھی کہا کہ اُن کی فرمایش پر آپ آتش کدۂ ابراہیم میں سے انعام اللہ خاں یقینؔ کے حالات لکھ کر لائے ہیں۔ چونکہ یقینؔ کا دیوان مولوی صاحب طبع کرا رہے ہیں اور اس کا انتظام میرے سپرد ہے اس لیے انھوں نے فرمایا تھا کہ جو حالات آپ یقینؔ کے لکھ کر لائے ہیں وہ میں آپ سے طلب کر لوں۔ اگر وہ نوٹ عنایت ہو تو عین عنایت ہے اور اگر فرصت کے وقت مجھ سے مل لیجیے تو اس سے بھی زیادہ عنایت۔ بہرحال مجھے آپ کے خط اور نوٹ کا سخت انتظار رہے گا۔ کیونکہ میں نے یقینؔ کے

حالات لکھنے شروع کر دیے ہیں اور صرف آپ کے نوٹ کے انتظار میں روک دیے ہیں"۔

یہ خط انھوں نے ۲۴ مہر ۱۳۳۵ف کو لکھا تھا اور اس کے دوسرے یا تیسرے ہی دن میں نے ان کی فرمایش کی تعمیل کر دی لیکن ساتھ ہی ان کا دوسرا حکم نامہ وصول ہوا کہ ؎

"عنایت نامہ صادر ہوا۔ آپ کی عنایت کا شکریہ۔ مجھے تذکرۂ گلزار ابراہیم کے الفاظ کی ضرورت ہے اگر عنایت ہو تو مہربانی۔ آپ کسی وقت دفتر آجائیے۔ اگر ۱۱ اور ۱۲ کے درمیان ہو تو بہت ہی اچھا ہے۔ یہاں یقین کے متعلق آپ سے گفتگو بھی ہو جائے گی حیدرآباد میں بیٹھ کر جتنا مواد میں نے اس بارے میں جمع کر لیا ہے اس سے زیادہ جمع کرنا یہاں مشکل ہے بہرحال تشریف لائیے۔ اگر کل کسی وقت آجائیے تو اور بھی اچھا ہے کیونکہ بغیر آپ سے ملے اس مضمون پر آگے قلم نہ اٹھاؤں گا۔"

ان خطوں کے انداز تحریر سے ۲ دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ کس بے چینی اور سرگرمی سے اپنے مضمون کی تکمیل کے لیے کوشاں تھے اور طبیعت میں کیسی عجلت اور سیمابی کیفیت رکھتے تھے کہ پہلے خط میں گلزار ابراہیم کو آتش کدۂ ابراہیم لکھ گئے اور دوسرے خط میں پہلے ملنے اور پھر کل ہی ملنے پر اصرار کرنے لگے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس عجلت پسندی اور سیماب پائی کے باوجود اپنے پر کتنا جبر کرتے اور صبر و تحمل سے کام لیتے تھے کہ جب تک ٹھیک ٹھیک بات کا پتہ نہ چل جائے اور تلاش و تحقیق مکمل نہ ہولے اس وقت تک وہ اس مضمون پر آگے قلم نہیں اٹھانا چاہتے تھے۔

ایسی متضاد خصوصیتیں ادیبوں اور انشاپردازوں میں کم جمع ہوتی ہیں! اور چونکہ فرحت مرحوم نے ان پر قابو پالیا تھا اسی لیے ان کی ادبی تحقیق میں وہ شان پیدا ہوگئی جو بہت سوں کو نصیب نہ ہو سکی۔

یقین پر مضمون لکھنے اور ان کا دیوان بغرض طباعت مرتب کرنے کے لیے مرزا صاحب کو بہت زیادہ زحمت اٹھانی پڑی اور میرے خیال میں اتنی محنت اُنھوں نے کسی اور مضمون

کی ترتیب یا کسی اور کام کی انصرام کے لیے نہ کی ہوگی۔ جگہ جگہ سے دیوان یقین کے قلمی نسخے جمع کیے اور تیرہ ۱۳ نسخوں کے تقابلی مطالعے کے بعد ایک مکمل اور صحیح ترین نسخہ تیار کیا۔ دیوان کی تصحیح اور ترتیب کا کام ختم ہونے پر یقین کے حالات معلوم کرنے کے لیے کمربستہ ہوئے تو جیسا کہ خود لکھتے ہیں سیکڑوں کتابوں کی ورق گردانی صرف اس امید پر کی کہ شاید یقین یا اُن کے خاندان کا کچھ حال مل جائے۔ اس چھان بین میں ان کو تیس کتابیں ایسی ملیں جن سے اُنھوں نے اس تحقیقی مضمون کے لکھنے میں مدد لی۔ حوالے کی ان کتابوں کی ایک عمدہ اور جدید طرز کی مکمل فہرست بھی میرزا صاحب نے اس مضمون کے ابتدائی حصّے میں شامل کردی۔

اس سلسلے میں میرزا صاحب کی ایک اجتہادی غلطی کی طرف اشارہ کردینا ضروری ہے اور وہ یہ تھی کہ انھوں نے یقین اور ان کے زمانے کے لب ولہجے کو جو قدیم طرز املا کے ذریعے ہی سے واضح ہوسکتا اور محفوظ رہ سکتا تھا اپنے زمانے کے لب ولہجہ میں بدل ڈالا۔ وہ فرماتے ہیں ؎

"پرانے زمانے کی جتنی کتابیں چھپتی ہیں ان میں "تو" کو "توں"، "مجھ کو" کو "مجکوں" وغیرہ لکھا جاتا ہے تاکہ جوں کی توں نقل ہوجائے اور دیکھنے والا دیکھتے ہی سمجھ لے کہ اوہو بڑے پرانے زمانے کی کتاب ہے۔ میں نے اس پرانے طریقے کو ترک کردیا ہے۔ اور موجودہ زمانے کی املا میں الفاظ کو لکھا ہے تاکہ پڑھنے میں آسانی ہو۔ اور تحریر بدحیثیت نہ ہوجائے۔" (مقدمہ دیوان یقین صفحہ ۹)

اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی قدیم شاعر کو جدید دور میں مقبول بنانے اور اس کے کلام کو زبان زد خواص وعوام کرنے کے لیے یہ ایک مناسب طریقہ سمجھا جائیگا۔ لیکن اگر یہی عمل ہماری زبان کے مختلف العہد شعرا کے کلام کے ساتھ جائز رکھا جائے تو زبان کے تدریجی ارتقاء اور اس کے صوتی تغیرات کی تاریخ ناپید ہوجائے گی اور پھر کسی وقت کسی غیر معروف شاعر کے کلام کا قلمی نسخہ دیکھنے کے بعد یہ پتا چلانا دشوار ہوجائیگا کہ یہ کس دور کا شاعر تھا۔ مثال کے طور پر گولکنڈے کے ملک الشعرا وجہی کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

کھانا برہ کیتی ہوں میں پانی انجھو پیتی ہوں میں
تجھ تے بچھڑ جیتی ہوں میں کیا سخت ہے دل رے پیا

اس شعر کے دوسرے مصرع میں لفظ سے کی املات ۔ ے لکھی گئی ہے۔ اور عہد محمد قلی قطب شاہ میں "سے" "کو" "نے" ہی کہا کرتے تھے۔ اب اگر میرزا صاحب کا طریقہ اختیار کر کے وجہی کے دیوان یا اس کے عہد کے شعرا کے کلام کو موجودہ زمانے کی املا میں شایع کر دیا جائے تو اس سے ایک معمولی نقصان تو یہ ہو گا کہ جب کبھی کسی ایسے شاعر کا کلام ہو گا جو سے کی جگہ "تے" لکھتا ہو تو یہ معلوم کرنا دشوار ہو جائیگا کہ یہ کس عہد کا شاعر تھا۔ اس کے علاوہ ادب ولسانیات کے محققین کی نظر میں اس طریقۂ کار میں کئی اور قباحتیں موجود ہیں جن کی تفصیل یہاں بے موقع ہے۔

(۴)

فرحت مرحوم نے یقین کے خاندانی حالات جس تفصیل سے معلوم کیے اور جتنی شرح وبسط سے لکھے ہیں اس کے لیے اردو ادب کے مورّخ ان کے احسان مند رہیں گے۔ اردو کے بہت کم شاعروں کے ددھیالی اور ننھیالی اسلاف کی نسبت ایسی واضح معلومات قلمبند کی جا سکی ہیں اور یقین کے خاندان کی نسبت تو اتنی باتیں شاید ہی کوئی اور محقق معلوم کر سکتا اس لیے کہ میرزا فرحت اللہ بیگ کو دلّی اور اہل دلّی سے ایک خاص تعلق خاطر اور گہری محبت تھی۔ حضرت دہلی کے شریف اور اعلیٰ گھرانے کے خاندانی حالات کا وہ جس آسانی سے پتہ چلا سکتے اور ان کو جس واقف کاری اور بے تکلفی سے بیان کر سکتے تھے وہ کسی اور محقق کے بس کی بات نہ تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جتنے تحقیقی مضامین لکھے وہ زیادہ تر دلّی ہی کے مشاہیر شعر وادب سے متعلق لکھے اور ان میں بھی خواجہ بدرالدین خاں امان تو ان کے اسلاف ہی میں شامل تھے۔ غرض یہ جملہ تحقیقی مضمون اس شوق اور شایستگی کے ساتھ سوائے فرحت مرحوم کے اور کوئی لکھ بھی نہ سکتا تھا۔

یقین کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات معلوم و متعین کرنے کا میرزا صاحب نے جو طریقہ اختیار کیا وہ بالکل صحیح اور پختہ تھا۔ اس گتھی کو سلجھانے میں انھوں نے بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ البتہ یقین کی موت کے اسباب بیان کرنے کے سلسلے میں انھوں نے جملہ مذکورں

اور ماخذوں کے حوالے دینے اور اقتباسات پیش کرنے کے بعد بھی کوئی صحیح نتیجہ نکالنے سے احتراز کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید اس میں انھوں نے کوئی مصلحت دیکھی تھی یا مختلف تذکرہ نگاروں کی گوناگوں اور متضاد بیانی میں الجھ کر جھنجھلا گئے تھے۔ میرے خیال میں میر حسن کی شہادت معتبر ہے اور ان کے بیان کے بعد کسی مزید تائید کی تلاش غیر ضروری۔ اور ان کے بعد کے تذکرہ نگاروں کے بیانات کی صداقت مشتبہ تھی۔ خاص کر جب کہ ان متاخرین نے نہ تو میر حسن کے بیان کی تکذیب کی اور نہ اس میں کوئی اضافہ کیا۔ بلکہ انھی کے الفاظ کو مقدم موخر کر کے اصل واقعہ کو مسخ کر دیا تھا۔ پھر یہ بھی واضح ہے کہ میر حسن کا تذکرہ شعرائے اردو کے اکثر و بیشتر تذکروں کے مقابلے میں نہایت صحیح اور غیر جانب دار ہے۔ میر حسن نے ہر بات سوچ سمجھ کر اور ذمہ داری سے لکھی ہے اور اس کی اس خصوصیت کی نسبت مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم نے کافی جانچنے اور پرکھنے کے بعد رائے دی ہے کہ:-

"یہ نہ خیال کرنا کہ میر حسن صاحب کے یہاں حسن بیان اور حسن ظن کا دفتر کھلا ہوا ہے اور ہر شخص سند تعریف سے سرفراز ہوتا ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ وہی لکھا ہے جو خود دیکھا یا دوستان حقیقت داں سے سنا۔ ایسے شعرا بھی ہیں جن کی اخلاقی حالت معلوم نہ ہوئی ان کی نسبت کچھ نہیں لکھا مثلاً مصحفی۔ ان کے کلام کی فصاحت اور بلاغت کی تعریف کی ہے مگر اخلاقی حالت چونکہ معلوم نہ تھی اس لیے صرف اس قدر لکھا ہے۔" از تخلص معلوم می شود کہ مرد صالح ست"۔ (مقدمہ تذکرۂ میر حسن صفحہ ۱۵)

یقین کے تلمذ کے تذکرے اور اس بدگمانی کے ازالے میں کہ ان کا کلام میرزا مظہر جان جاناں کا کہا ہوا ہے فرحت مرحوم نے بڑی معرکہ آرا بحث کی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس معرکہ کو بڑی چابکدستی سے سر کیا ہے۔ تحقیق اور چھان بین کے جتنے طریقے ہو سکتے تھے ان سب سے کام لیا اور ایک ماہر فن اور بختہ کار جج بن کر بڑا اچا تلا فیصلہ لکھا اور اس بارے میں تذکرہ نگاروں کے جو چار گروہ پیدا ہو گئے تھے ان کے اختلاف کو ہمیشہ کے لیے رفع کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قانون دانی کی مہارت اور ملازمت کے تجربے نے اس جھگڑے سے نبٹنے میں

ان کی بڑی مدد کی ہے۔ میری رائے میں انعام اللہ خاں یقینؔ کے مضمون کا یہی حصہ پورے مضمون کی جان ہے۔ اس بحث کے لیے فرحت مرحوم نے ۲۲ صفحے وقف کیے ہیں۔ لیکن اس طوالت کے باوجود اس بیان میں ایک لفظ بھی غیر ضروری اور زیب داستان کے لیے نہیں لکھا۔ اگرچہ ایک آدھ جگہ اس کا موقع آ بھی گیا تھا کہ وہ اپنی بیباک فطرت سے مجبور ہو کر غیر محتاط ہو سکتے لیکن ایسا نہیں ہونے دیا اور ہر لفظ محمد حسین آزادؔ کی طرح قلم سنبھال کر لکھا ہے۔

یہاں یقینؔ کے حالات کی نسبت میرزا صاحب کی تحقیق ختم ہو جاتی ہے! اور اس کے بعد انھوں نے یقینؔ کے دیوان اور کلام کی طرف توجہ کی ہے۔ یہی دراصل ان کا موضوع تھا! ور مضمون کا نصف حصہ اسی کے لیے وقف کیا گیا ہے۔ پہلے انھوں نے دیوان یقینؔ کی غزلوں اور اشعار کی تعداد کو معین کیا ہے اور پھر ان غزلوں کو بڑی تحقیق اور احتیاط سے دوسرے شعرا مثلاً فغاںؔ، مضمونؔ اور کرم اللہ خان دردؔ وغیرہ کے اس کلام سے علیحدہ کر دکھایا ہے۔ جو کاتبوں کی عنایت سے دیوان یقینؔ کے بعض نسخوں میں شامل ہو گیا تھا۔ اس کام میں نہ صرف وسعت مطالعہ بلکہ ذوقِ سخن کا بڑا اچھا ثبوت دیا ہے۔

فرحت مرحوم نے یقینؔ کی بحروں اور قافیوں پر بھی تحقیقی نظر ڈالی ہے اور اس کے بعد ان کے کلام کی خصوصیات قلمبند کرنے میں مصروف ہو گئے ہیں۔ اس عنوان میں پہلے مختلف شاعروں اور تذکرہ نگاروں کی رائیں لکھی ہیں پھر یقینؔ کے ہمعصر شعرا حاتمؔ، میرؔ، سوداؔ، دردؔ، تاباںؔ، بیاںؔ، حزیںؔ اور صاحبؔ وغیرہ کی ان غزلوں سے یقینؔ کی غزلوں کا مقابلہ کیا ہے جو ایک ہی زمین میں لکھی گئی ہیں۔ اور آخر میں یقینؔ کی زبان پر بحث کی ہے اور اس کے ساتھ ہی یقینؔ اور دوسرے مشاہیر شعرا کے ہم مضمون اشعار پیش کر کے اور ان پر تبصرہ لکھ کر اس مقدمے کو ختم کر دیا ہے۔ یہ آخری حصہ زیادہ تر تنقیدی اور اس کی ترتیب میں اعلیٰ معیار تنقید اور شایستہ ذوق سخن سے کام لیا گیا ہے۔

(۵)

یقینؔ کے بعد میرزا فرحت اللہ بیگ نے حکیم آغا جان عیشؔ کی طرف توجہ کی ہے۔ اس مضمون کا آغاز انھوں نے اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں کیا ہے۔ یہ تمہید گویا محمد حسین آزادؔ

پر ایک چبھتا ہوا سا طویل تبصرہ ہے جس کا لب لباب خود ان کے الفاظ میں یہ ہے کہ ۔

"آزاد مرحوم نے اپنے استاد کو خلعت دوام دینے کے لیے بہتوں کے خلعت یا تو اتار لیے یا پھاڑ چیر کر گدڑی کر دیے اور اس غرض کو حاصل کرنے میں کچھ خود محنت کی کچھ دوسروں کے سر ڈال دی۔ وہ جانتے تھے اگر ہدہد کو غالب اور مومن جیسے لوگوں سے مشاعرے میں لڑا دونگا تو دنیا بھر میں کوئی بھی میری بات ماننے والا نہیں۔ اس لیے انھوں نے یہ کیا کہ ہدہد کو حکیم آغا جان عیش کا بچھو بنا کر میدان میں اُتارا۔ جو جانور ہدہد کے مقابلے میں آیا اس کو کسی نہ کسی بڑے شاعر سے منسوب کر دیا اور اس پالی کے ہار جیت سے کچھ نہ کیا تو کم سے کم ذوق کے برابر والوں کا مذاق اڑا کر ان کی شان میں بٹّا ضرور لگا دیا"۔ (حصۂ دوم صفحہ ۱۲۵)

یہی گویا اس مضمون کا سبب تالیف ہے۔ فرحت مرحوم نے حکیم آغا جان عیش کے کلام سے ہدہد کے کلام کا مقابلہ کیا تو زمین آسمان کا فرق نظر آیا۔ حالانکہ آزاد نے یہ ظاہر کیا تھا کہ عیش ہی ہدہد کے کلام کے مصنف تھے۔ فرحت مرحوم نے اس کو غلط ثابت کرنے کے لیے پہلے عیش کے وہ چند اشعار پیش کیے ہیں جو خوش مذاقی کی حد میں داخل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں ۔

"لیجیے یہ ہے حکیم صاحب کے دونوں دیوانوں کی خوش مذاقی کا خلاصہ اس کے بعد بھی اگر آپ آزاد مرحوم کی اس تحریر کو صحیح سمجھیں اور یہ فیصلہ کریں کہ آغا جان عیش ہی ہدہد کو شعر لکھ کر دیا کرتے تھے اور اس لیے دیا کرتے تھے کہ اس زمانے کے نامور شعرا پہ چوٹ کی جائے تو آپ جانیں اور آپ کا دین و ایمان جانے"۔ (حصۂ دوم صفحہ ۱۲۷)

ایمان کی بات تو یہ ہے کہ فرحت مرحوم کی اس سعی کے بعد یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ حکیم آغا جان عیش کا ذوق ہدہد کے مذاق سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ ممکن ہے کہ حکیم صاحب کی پارٹی کے کوئی اور صاحب ہدہد کو شعر لکھ دیتے ہوں اور چونکہ مشاعروں

حکیم آغا جان عیش ہدہد کی تائید کر دیا کرتے تھے اس لیے آزاد کو یہ شبہ ہوا اور انھوں نے اپنی عادت کے مطابق اس کا ایک ڈراما تیار کر دیا جس کا در و بست فنی نقطۂ نظر سے اتنا مکمل ہے کہ میرزا صاحب کے اس طویل تحقیقی اور اختلافی بحث کے باوجود اپنی جگہ پر باقی رہے گا۔

اس حقیقت کے قطع نظر، فرحت مرحوم کا یہ مضمون ان کی اپنی سعی و کاوش کی وجہ سے ایک تحقیقی تخلیق بن گیا ہے۔ اس لیے کہ آزاد کے سوا کسی اور تذکرہ نگار نے حکیم آغا جان عیش کی طرف توجہ ہی نہیں کی تھی اور جس کسی نے ان کو درخور اعتنا سمجھا تو سوائے ایک آدھ سطر کے کچھ نہ لکھا۔

محمد حسین آزاد کا یہ کارنامہ بھی قابل داد ہے کہ وہ اردو ادب کی تاریخ اور تحقیق کے لیے آبِ حیات میں ایسے بیج بو گئے جو کسی نہ کسی دور میں اُبھتے رہیں گے اور برگ و بار لاتے رہیں گے۔ فرحت مرحوم کو خود اعتراف ہے کہ :-

"مجھے حکیم صاحب کے دیوان دیکھنے اور ان کے حالات معلوم کرنے کا شوق آبِ حیات نے دلایا۔" (حصۂ دوم صفحہ ۱۲۸)

اب آپ جانتے ہیں کہ میرزا صاحب کے دماغ میں جب کوئی شوق سماتا ہے تو وہ نچلے بیٹھنے والے انسان تو نہ تھے۔ اسی ادھیڑ بن میں حکیم صاحب کے پڑپوتے سے اُن کی ملاقات ہو گئی۔ ان سے معلومات حاصل کر کے لالہ سری رام کے یہاں سے ایک دیوان حاصل کیا اور ایک دیوان حکیم صاحب کی پوتی سے لیا۔ اور موخر الذکر ہی سے حکیم صاحب کے حالات معلوم کیے۔ اسی سلسلے میں فرماتے ہیں :-

"جب آبِ حیات میں سے حکیم صاحب کا حال اُن کی پوتی کو سنایا تو وہ تعجب سے پوچھنے لگیں" میاں جنھوں نے یہ کتاب لکھی ہے کیا اُنھوں نے دادا جان کو دیکھا تھا یا جو جی میں آیا لکھ دیا۔" لیجیے یہ ہے آزاد مرحوم کی تحریر کے متعلق خود حکیم آغا جان عیش کی پوتی کی رائے۔" (حصۂ دوم صفحہ ۱۲۹)

اس کے بعد حکیم صاحب کے بارے میں آزاد کا بیان نقل کیا ہے اور پھر اُن کی پوتی نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کو درج کیا ہے اور یہ بیان "حکیم صاحب کے متعلق میری دریافت" کی سرخی قایم کرکے نہایت تفصیل سے مختلف ذیلی عنوانوں کے تحت قلمبند کیا ہے۔

چونکہ میرزا صاحب کی معلومات کا واحد ذریعہ حکیم صاحب کی پوتی اور پڑپوتے تھے اس لیے محض ان کے بیانات کی بنا پر آزاد کی معلومات کو قطعی غلط ٹھیرانا قرین انصاف نظر نہیں آتا۔ اور اس مقدمے میں اس وجہ سے بھی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے کہ میرزا صاحب نے نہ پوتی کا نام بتایا اور نہ پڑپوتے کا۔ گویا غیر معروف اور گمنام اشخاص کی شہادت پر آزاد کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا۔

حکیم صاحب کے حالات کی مختصر سی تحقیق کے بعد میرزا صاحب نے ان کے کلام کی طرف توجہ کی ہے اور اس مضمون کا یہی حصہ زیادہ محنت اور عرق ریزی سے قلمبند کیا گیا ہے یہ اس لیے اہم ہے کہ میرزا صاحب نے ایک استاد سخن کو اردو دنیا میں پہلی بار نہایت شرح وبسط کے ساتھ روشناس کیا ہے۔ اور ان کے کلام میں سے ہر صنف سخن کے وافر نمونے اپنی تشریح اور تبصرے کے ساتھ نقل کیے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر یہ مضمون نہ لکھا جاتا تو عیش دہلوی کی شاعری کی خصوصیات سے اردو دنیا ناواقف رہتی اور چونکہ ان کے دیوان کی نقلیں موجود نہیں ہیں اس لیے اگر آپ خدانخواستہ اصل نسخے ضایع بھی ہو جائیں تو عیش کے سرمایۂ حیات کے تلف ہو جانے کا امکان باقی نہ رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ میرزا صاحب اپنے اس مضمون کے ذریعے سے عیش کے نام اور کام کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر گئے ہیں۔ انھوں نے اس کے آخری جملوں میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ۔

"چلتے چلاتے (عیش) اپنی کمائی ہنڈل میں باندھ ہم کو دے گئے ہیں کہ لو بھئی یہ تمھارا مال ہے اب تم جانو اور تمھارا کام جانے۔ سنبھال کر رکھا اور اس مال میں اضافہ کیا تو ہمارا نام بھی رہ جائیگا تمھارا بھی نام ہوگا نہیں تو جس طرح دلی کھو بیٹھے اسی طرح زبان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

(حصۂ دوم صفحہ ۱۹۱)

(۶)

میرزا صاحب کا تیسرا تحقیقی مضمون ان کے دادا خواجہ بدرالدین خاں اماؔن پر لکھا گیا ہے۔ اس کے سبب تالیف کی نسبت اس مضمون کے اوایل ہی میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ مقدمۂ دیوان یقیںؔ کے بعد میرزا صاحب کا یہ دوسرا اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس کی ترتیب کے لیے بھی ان کو کافی تلاش اور پوچھ گچھ کرنی پڑی۔ اس کے ماخذوں کا ذکر خود انھوں نے اس طرح کیا ہے ؎

"میں نے اس مضمون میں خواجہ اماؔن مرحوم کے خاندانی حالات کچھ تو ہندوستان کی تاریخوں اور خود ان کی کتابوں سے لیے ہیں اور کچھ میرزا غالبؔ کے خطوں اور خواجہ قمرالدین خاں راقمؔ (فرزند خواجہ امان) کی تحریروں سے حاصل کیے ہیں اور ان سب کا مقابلہ ان کے پوتے خواجہ امیرالدین مرحوم کی اس درخواست سے کیا ہے جو انھوں نے سنہ ۱۹۱۱ء کے دربار تاج پوشی کے موقعہ پر لاٹ صاحب کو دی تھی۔ اب رہے ان کے حالات زندگی، ان کا اٹھنا بیٹھنا، ان کا رہنا سہنا، اور ان کا میل جول وغیرہ تو یہ سب میں نے اپنے بزرگوں سے پوچھ پوچھ کر لکھا ہے لیکن اس پوچھ گچھ میں جو دقتیں مجھے پیش آئی ہیں وہ میرا دل ہی خوب جانتا ہے۔" (حصۂ چہارم صفحہ ۱۹۰)

خواجہ اماؔن میرزا فرحت اللہ بیگ کی حقیقی نانی گوہر آرا بیگم کے والد تھے۔ اس کے علاوہ میرزا صاحب کے دادا میرزا عبداللہ بیگ خواجہ امان کے سگے ماموں میرزا افضل بیگ کے فرزند تھے۔ اس طرح خواجہ اماؔن سے میرزا فرحت کو ددھیالی اور ننھیالی دونوں طرف سے خونی رشتہ تھا۔ اس تعلق کو انھوں نے اسی مضمون میں ایک شجرے کے ذریعے سے واضح کیا ہے۔

یہ مضمون اس لیے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اردو کے ایک نثر نگار پر لکھا گیا ہے اور جیسا ڈاکٹر مولوی غلام یزدانی کا خیال ہے اردو ادب کی یہ بدقسمتی ہے کہ اس میں شعرا کے

مقابلے میں نثر نگاروں کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔

یہ مضمون اس لیے بھی اہم ہے کہ اس میں حقیقی معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ سوائے فرحت مرحوم کے کوئی اور فراہم نہ کرسکتا تھا۔ اس اہمیت کو مولوی عبدالحق صاحب بھی محسوس کرچکے تھے اور مولوی غلام یزدانی صاحب کی طرح سمجھتے تھے کہ اگر فرحت نے اس پر قلم نہ اٹھایا تو اردو کا ایک بڑا انشاپرداز ہمیشہ کے لیے گوشۂ گمنامی میں پڑا رہ جائیگا۔ چنانچہ اس کی تکمیل کے لیے انھوں نے بار بار فرحت مرحوم سے اصرار کیا۔ وہ لکھتے ہیں ؂

"مولوی عبدالحق صاحب تو میرے پیچھے پڑ گئے اور پیچھے کیا پڑے گویا میری چڑ مقرر کرلی۔ جب اور جہاں کہیں ملتے سب سے پہلے یہی پوچھتے کہ کیوں بھئی ہمارا وہ خواجہ امان والا مضمون لکھا"۔ (حصۂ چہارم صفحہ ۱۸۹)

اس کے باوجود میرزا صاحب نے دو برس سے کچھ اوپر تقاضوں ہی تقاضوں میں نکال دیئے۔ مگر چند ہی دنوں میں خاندان کے بعض بزرگوں کے اٹھ جانے سے خود ان کو احساس ہوا اور انھوں نے اس کی ترتیب کا تہیا کرلیا۔ بس اسی کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد جتنی ترکیبیں معلومات کی فراہمی میں استعمال کرسکتے تھے ان سب سے کام لیا اور اردو میں ایک ایسا تخلیقی مضمون چھوڑ گئے ہیں جو اپنی آپ نظیر ہے اور جس کی وجہ سے اردو کے ایک بڑے نثر نگار کے حالات اور اس کی نثر کی خصوصیات محفوظ ہوگئیں۔

اس مضمون کا ابتدائی نصف حصہ خواجہ امان کے خاندانی حالات کی روزمرہ کی زندگی، عادات و اطوار اور دیگر ضروری معلومات کے لیے وقف کیا گیا ہے۔ یہ حصہ بہت دلچسپ ہے اور اس میں جو معلومات درج ہیں اُن سے نہ صرف امان بلکہ اردو کے بہت بڑے شاعر میرزا غالب کی حیات کے بعض پہلوؤں پر بھی بالواسطہ روشنی پڑ جاتی ہے۔ اور کوئی تعجب نہیں اگر میرزا فرحت کی تحریروں کی روشنی میں میرزا غالب کے خاندانی اور نجی حالات کے بارے میں ابتک جو معلومات شایع ہوچکی ہیں ان میں ترمیم اور تشریح کی ضرورت نہ پڑے۔ غالب کے ایک سوانح نگار مولانا غلام رسول مہرنے علیگڈھ میگزین کے "غالب نمبر" میں جو ابھی چند ماہ قبل شایع ہوا ہے "غالب کی خاندانی پنشن" کے عنوان پر ایک مضمون لکھا

ہے جس میں میرزا فرحت اللہ بیگ کے اس مضمون کے ابتدائی حصے سے سخت اختلاف کیا ہے۔ اور میرزا امان کے جو خاندانی حالات انھوں نے لکھے ہیں ان سب کو یکے بعد دیگرے غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا مہر نے میرزا فرحت کے ارشادات کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے ایک حصہ خاندانی حالات کے متعلق ہے اور دوسرا پنشن کے متعلق۔ خاندانی حالات کے حصے کا خلاصہ دس فقروں میں کیا ہے اور اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں ؎

"ظاہر ہے کہ اگر ان ارشادات کو درست سمجھا جائے تو میرزا غالب کے ان بیانات کو غلط ماننا پڑیگا۔" (غالب نمبر صفحہ ۱۱۹)

لیکن میرزا غالب کے بیانات کی صحت کی نسبت اسی علیگڈھ میگزین کے ایک مضمون نگار قاضی عبدالودود اپنے مضمون "غالب بحیثیت محقق" میں یوں رقم طراز ہیں۔

"ان میں (غالب میں) اعوجاج ذہن، ضعف حافظہ، خود پرستی، ناتوان بینی، بے پروائی، سہل انگاری اور ضد انتہائی درجے کی ہے اور جن طبایع میں یہ خصوصیات پائی جائیں انھیں تحقیق سے کچھ سروکار نہیں ہو سکتا۔" (غالب نمبر صفحہ ۱۷)

یہ تو غالب کی حقیقت بیانی کے خلاف ایک ہی دلیل ہے۔ اس طرح کی قاضی عبدالودود نے چار دلیلیں پیش کی ہیں اور ان کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں ؎

"افسوس کی جگہ ہے کہ غالب نے یہ محسوس نہیں کیا کہ ان کی شاعری، ان کی انشاپردازی اور ان کی ظرافت انھیں زندگیٔ جاوید بخشنے کے لیے کافی ہے۔ اور ایسے کام میں ہاتھ ڈالا جس کے لیے نہ وہ طبعاً موزوں تھے اور نہ جس کے لئے انھوں نے کچھ زیادہ تیاری کی تھی۔ غالب اپنی زبان سے اپنے کو محض اکمل اور ہمہ داں عدیم النظیر کہیں؛ اور اپنے منزہ عن الخطا ہونے کا اعلان کریں، ان کے مداح انھیں شہنشاہ ممالک عربی و فارسی کا لقب دیں لیکن ان کے معلومات اتنے قلیل، ان کے اغلاط اتنے مختلف الانواع اور کثیر التعداد ہیں کہ بزم محققین کی صف نعال میں بھی

ان کے لیے جگہ نکالنی مشکل ہے۔" (علیگڈھ میگزین غالب نمبر صفحہ ۱۷۲)

بہر حال قاضی عبدالودود کے اس طویل مضمون نے غالب کے اکثر بیانات اور تحقیقات کو غلط ثابت کردیا ہے اور اس کے پیش نظر مولانا مہر کا محض میرزا غالب کے بیانات کو صحیح اور میرزا فرحت کے بیانات کو غلط قرار دینا ایک زیادتی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں مولانا مہر نے بعض امور ایسے بھی پیش کیے ہیں جو توجہ اور بحث طلب ہیں اور جن کے باعث میرزا فرحت کے اس مضمون کے ابتدائی حصے پر چند اہم اعتراضات وارد ہوگئے ہیں جن کی یکسوئی ضروری ہے اور ان کا تصفیہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ میرزا جیون بیگ یا میرزا حاجی خاں کی اولاد یا آل میں سے کوئی صاحب مولانا مہر کے اس مضمون کا جواب دلایل کے ساتھ قلمبند نہ کریں افسوس ہے کہ جس پنشن کے جھگڑوں میں میرزا غالب کی عمر کا بڑا حصہ صرف ہوا اور جس کے لیے انہوں نے میرزا حاجی کو پاجی اور سائیس زادہ اور بہت کچھ لکھا اس کے حاصل کرنے والے نہ غالب کے گھر میں رہے اور نہ میرزا حاجی کے! اور اس طرح بقول میرزا فرحت "وہ جاگیر جو نسلاً بعد نسلاً اور تا دور شمس و قمر جاری ہوئی تھی وہ دو ہی پشت میں ٹھکانے لگ گئی"۔ لیکن ان دونوں خاندانوں کے افراد نے ایک دوسرے کی نسبت جو کچھ کہا اور لکھا وہ باقی رہ گیا! اور مولانا غلام رسول مہر اور قاضی عبدالودود جیسے محققین میرزا غالب اور میرزا فرحت کی تحریروں کے اختلافات پر نہ معلوم کب تک ردّ و قدح کرتے رہیں گے۔

خواجہ امان کے خاندانی اور خانگی حالات کی وضاحت کے بعد فرحت مرحوم نے ان کے ترجمۂ بوستان خیال کی طرف توجہ کی ہے اور اس پر اتنا تفصیل سے لکھا ہے کہ اس مضمون کا نصف آخر اسی مضمون پر مشتمل ہے۔ اس میں بوستان خیال کی ضخامت۔ ترجمہ کی خصوصیات، مختلف جلدوں کی اشاعت کی تاریخیں وضاحت کے ساتھ قلمبند کیں اور دوسرے مترجموں کے ترجموں سے امان کے ترجموں کا خوش اسلوبی سے مقابلہ کیا ہے۔ اسی سلسلے میں میرزا غالب کی داستانوں سے دلچسپی اور خاص کر بوستان خیال سے ان کے تعلق خاطر کی نسبت بھی بعض نئی معلومات منظر عام پر آگئی ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بوستان خیال کے ترجمے کی تکمیل کی طرف امان کو متوجہ رکھنے

میں میرزا غالب کا بھی ہاتھ تھا اور یہ موضوع بجائے خود ایک علٰحدہ مضمون کا محتاج ہے۔ وہ اماں سے اس کا ترجمہ سنتے اور شاید اصلاح دیتے تھے اور جب ہر جمعرات کو شام میں تین گھنٹے تک ان کے ہاں داستان ہوتی تھی تو داستان گو کو بوستان خیال یاد کرنے پر مجبور کرتے اور جب وہ تیار ہو کر آتا اور سنانے لگتا تو فنّی باتوں کے سمجھانے کے لیے سلسلۂ کلام خود لیتے تھے اس کی اشاعت کے وقت انھوں نے اس پر ایک مقدمہ لکھا اور اشاعت کے بعد اپنے شاگردوں اور دوستوں کو اس کی خریداری کی طرف متوجّہ بھی کیا۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اس کی پہلی جلد کی اشاعت سے قبل صفیر بلگرامی کا ترجمہ بوستان خیال بھی دیکھ لیں۔ خواجہ اماں کی پہلی جلد ۱۸۶۶ء میں شایع ہوئی تھی اور غالب نے اپریل ۱۸۶۵ء میں عظیم آباد کے ایک مطبع عظیم المطابع کے مہتمم میر ولایت علی کے نام دو خط لکھے تھے اور صفیر بلگرامی کی بوستان خیال طلب کی تھی۔ اس کے لیے وہ اتنے منتظر تھے کہ دوسرے خط میں لکھتے ہیں ؎

"خدا کرے کہ کتاب وہاں سے پہلے روانہ ہو اور یہ لفافہ وہاں بعد پہنچے"

(آثار غالب صفحہ ۶ علیگڈھ میگزین غالب نمبر)

عجب بات یہ ہے کہ فرحت مرحوم نے بوستان خیال کے جملہ ترجموں کا ذکر کیا اور میرزا احمد عسکری، حکیم محمد مقرب حسین خاں، اور نواب میرزا حسین علی خاں کے ترجموں سے اماں کے ترجموں کی عبارتوں کا زبان اور صحت مضامین کے اعتبار سے مقابلہ اور موازنہ کیا ہے لیکن پورے مضمون میں صفیر بلگرامی کے ترجمے کا نام تک نہیں لیا۔ حالانکہ بوستان خیال کا یہ ترجمہ خواجہ اماں کے ترجمے کی پہلی جلد سے ایک دو سال قبل چھپ کر شایع ہو چکا تھا۔ ممکن ہے کہ صفیر بلگرامی کے ترجمے کا فرحت مرحوم کو علم ہی نہ ہوا ہو اور چونکہ میرزا غالب کا وہ خط جس کا اقتباس ابھی درج کیا گیا ہے فرحت کی وفات کے بعد شایع ہوا ہے اس لیے گمان غالب ہے کہ فرحت نے عمداً صفیر کے ترجمۂ بوستان خیال سے بے اعتنائی نہیں کی۔

تراجم بوستان خیال کے سلسلے میں میرزا صاحب نے اصل فارسی کتاب کے مصنف محمد تقی جعفری اور ان کی تالیف کی نسبت بھی تفصیل سے معلومات لکھدی ہیں۔ اور اس طرح بدرالدین خان اماں کا مضمون طویل ہو کر ایک مستقل کتاب بن گیا ہے جو اردو نثر کی

تاریخ میں ایک مستقل اضافہ ہے۔

(۷)

حافظ عبدالرحمن خان احسان صمصام الدولہ احتشام جنگ دہلوی خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق سے پہلے لال قلعے میں استاد مانے جاتے تھے اور بادشاہ اور ان کے جملہ متعلقین ان کے شاگرد تھے۔ شاہ نصیر سے ان کے معرکے رہے اور بعد میں ذوق سے بھی مقابلے ہوئے لیکن وہ اپنی موت تک بڑے دم خم کے ساتھ مقابلے پر ڈٹے رہے۔

فرحت مرحوم دہلی کے مشاہیر شعرا کو روشنی میں لانے اور ان کے کلام کو اردو دنیا میں روشناس کرنے کی فکر میں تھے۔ ہر چند کہ انھوں نے اپنے اس ارادے کا اظہار نہیں کیا لیکن جیسا کہ مضمون میں پہلے اشارہ کیا گیا ہے دلی اور اہل دلی کی محبت نے ان کو اس کام کی طرف مایل کر دیا تھا اور ان کا یہ چوتھا تحقیقی مضمون اسی سلسلے کی ایک کڑی نظر آتا ہے۔

میرزا صاحب نے خلاف عادت اس کا سبب تالیف نہیں بیان کیا۔ صرف یہ لکھا ہے کہ ان کے دیوان کی تلاش تھی جو کمیاب بلکہ نایاب تھا۔ اسی جستجو میں نواب سالار جنگ مرحوم کے یہاں ایک اور آغا حیدر حسن مرزا کے یہاں ایک اس طرح دو دیوان ان کو مل گئے اور انھوں نے اول الذکر دیوان کی نقل بھی کرلی لیکن جیسا کہ فرماتے ہیں ؂

"نقل کر ڈالی مگر بجائے پڑھنے کے جوش ٹھنڈا ہو کر رہ گیا۔ ہر قسم کے صنایع لفظی اور خاص کر رعایت لفظی سے مجھے کچھ للہی بغض ہے۔ ان کا سارے کا سارا دیوان اس سے بھرا پڑا ہے۔ نقل تو کرلی مگر دل چھوٹ گیا۔ یہ نقل یوں ہی ایک سال تک پڑی رہی۔ اب ایک دفعہ ہی خیال آیا کہ جب نقل کرنے کی محنت اٹھائی ہے تو لاؤ اس پر ایک مضمون ہی لکھ ڈالو۔ محرم کی چھٹیاں ہیں لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔" (حصۂ ششم صفحہ ۱۴۴)

یہ مضمون پونیا سایز کے ۱۰۶ صفحات پر چھپا ہے اور ان چھٹیوں ہی میں آٹھ دس دن کے اندر تکمیل کر لیا گیا ہے۔ اس سے ان کے قلم کی تیز رفتاری اور ذہن کی براقی کا ایک اور ثبوت ملتا ہے۔

اس مضمون کی تیاری میں میرزا صاحب کو غالباً زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی کیونکہ پروفیسر آغا حیدر حسن صاحب اپنے پرنانا احساؔن کے حالات لکھ رہے تھے۔ چنانچہ میرزا صاحب فرماتے ہیں ؎

"آغا صاحب اپنے نانا نواب احمد حسن خاں سے پوچھ پوچھ کر احسان کے حالات لکھ رہے ہیں۔ وہ کاغذات بھی انھوں نے مجھے دے دیے اور کیوں نہ دیتے مفت میں ان کے پرنانا کا حال ایک بھلا مانس لکھ رہا تھا۔" (حصۂ ششم صفحہ ۱۴۶)

اس امر کا اظہار بھی یہاں ضروری ہے کہ حافظ عبدالرحمٰن خاں احساؔن فرحت مرحوم کے دو دوستوں آغا حیدر حسن صاحب اور عظمت اللہ خاں مرحوم کے پرنانا تھے۔ وہ یوں کہ احسان کے دو فرزند تھے سیف الرحمٰن خاں اور عبدالحکیم خاں۔ آغا حیدر صاحب اول الذکر کے نواسے ہیں اور عظمت مرحوم موخرالذکر کے۔ اس مضمون کے سبب تالیف میں ممکن ہے کہ ان تعلّقات کو بھی دخل ہو۔ چونکہ احساؔن کا کلام میرزا صاحب کی افتادِ طبع سے مناسبت نہ رکھتا تھا اس لیے ان کا یہ مضمون ان کے حسبِ دلخواہ لکھا نہیں گیا۔ اور اس کا سبب انھوں نے ماہ محرم کو قرار دیا۔ چنانچہ اس کے خاتمے میں لکھتے ہیں ؎

"محرم کا زمانہ ہے طبیعت خود پژمردہ ہے مضمون میں بھی اگر افسردگی ہو تو کچھ تعجب نہیں۔ مضمون لکھنے سے میری یہ غرض نہیں اور نہ ہے کہ آسمان کے تارے توڑ لاؤں یا ایسا مضمون لکھوں کہ دھاک بیٹھ جائے میں تو یہ چاہتا ہوں کہ جو کچھ گزشتہ اور پابہ رکاب بزرگوں سے معلوم ہو جائے اس کو محفوظ کر دوں بعد میں کوئی بھلا آدمی ان واقعات اور حالات کو سلیقے سے جما لیگا۔" (حصۂ ششم صفحہ ۲۴۸)

مگر واقعہ یہ ہے کہ خود میرزا صاحب نے یہ مضمون کافی سلیقے اور اہتمام سے مرتّب کیا ہے۔ انھوں نے پہلے احساؔن کے کلام کے موجودہ محفوظ نسخوں پر تحقیق کی ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جہاں احسان کے ایک شاگرد شہزادہ معزالدین ثابت نے اپنے استاد کا ایک دیوان مرتّب

کیا، ایک دوسرے شاگرد میرزا قادر بخش موزوںؔ نے ان کا کلیات جمع کیا تھا۔ اول الذکر کی نقل سالار جنگ بہادر کے یہاں سے ملی اور موخر الذکر کی آغا حیدر حسن صاحب سے۔

اس کے بعد میرزا صاحب نے معزّ الدین ثابت کا اصل فارسی دیباچہ نقل کیا ہے اور اس کا ترجمہ ایک دلچسپ نوٹ کے ساتھ حاشیے میں شامل کیا ہے جو یہ ہے ؎

"کیا اچھا ہوتا کہ صاحب علم یہ دیباچہ اردو میں لکھ دیتے کم سے کم یہ تو فائدہ ہوتا کہ ترجمہ کرنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑتی"۔ (حصّہ ششم صفحہ ۱۴۸)

سچ تو یہ ہے کہ میرزا صاحب نے یہ دوگونا زحمت خواہ مخواہ برداشت کی ہے۔ نہ اس طویل فارسی دیباچے کو من وعن نقل کرتے اور نہ اس کا لفظی ترجمہ کرنے ہی کی محنت برداشت کرتے۔ اگر اس کے مطلب ہی کو بطور خلاصہ وہ اپنی زبان میں لکھدیتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔

احسانؔ کے حالات بیان کرنے کے سلسلے میں میرزا صاحب نے ان کے کلام سے بھی مدد لی ہے اور اس سے مضمون میں کافی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے اور کہیں کہیں آزاد کا رنگ جھلکنے لگا ہے۔

احسانؔ کے کلام سے شاہ عالم، اکبر شاہ ثانی، اور بہادر شاہ ظفر تین بادشاہوں کے زمانے کی بعض تاریخی معلومات اور لال قلعے کی اندرونی حالت کی نسبت بعض ایسی باتوں کا علم ہوتا ہے جن کا تاریخوں میں پتا نہیں چلتا اور ان امور کو فرحت مرحوم نے مضمون کے اس حصّے میں بڑی خوش اسلوبی سے واضع کردیا ہے۔ اس کے بعد احسانؔ کے مذہب اور تلمذ سے بحث کی ہے اور اسی سلسلے میں احسانؔ کے سفر لکھنؤ کے دلچسپ واقعات بیان کیے ہیں لیکن اس سفر کا جو سبب قرار دیا ہے وہ کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

ہرچند کہ یہ واقعہ محمد حسین آزاد کے ڈرامائی انداز میں لکھا گیا ہے اور فرحت مرحوم کے اس تحقیقی مضمون کا یہ حصّہ آبِ حیات کا ایک ٹکڑا نظر آتا ہے لیکن میرے خیال میں احسانؔ کے سفر لکھنؤ کا سبب وہ نہیں تھا جو میرزا صاحب نے ثابت کرنا چاہا ہے بلکہ اس کی وجہ اکبر شاہ ثانی کی ناراضی تھی کسی چغلخور نے چغلی کھائی تھی اور احسانؔ قلعے سے نکالے گئے تھے اور اسی زمانے میں لکھنؤ کی قدردانی اہل کمال کا حال سنکر اور یہ جان کر کہ اس وقت وہاں دلّی ہی کے

ایک سیدزادے اعتمادالدولہ فضل علی خاں خدمت وزارت پر فائز ہیں احسان نے یہ سفر کیا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے مقصد میں ناکام رہے اور ایک سال کے اندر ہی اپنے وطن کو لوٹ آئے جہاں ان کی اتنی بڑی جائداد تھی کہ وہ بڑے امیر اور رئیس سمجھے جاتے تھے کوئی شاعری پر تو ان کا گزارا تھا نہیں کہ شاہ نصیر کی طرح وطن سے آوارہ ہوتے۔

اپنے دوسرے تحقیقی مضامین کی طرح فرحت مرحوم نے اس مضمون کا آخری نصف حصّہ بھی کلام پر تنقید و تبصرے کے لیے وقف کیا ہے اور اس کو بڑی محنت اور شایستگی سے لکھا ہے۔ احسان کی شاعری کی خصوصیتیں مختلف عنوان قایم کر کے واضح کی ہیں۔ ان کی زمینوں، قافیوں، لفظی رعایتوں، کمزوریوں اور عربی کے فقروں غرض ہر ضروری عنوان پر تھوڑی یا بہت بحث کی ہے۔ حکیم آغا جان عیش کے کلام سے میرزا صاحب کو شکایت تھی کہ وہ بہت سنجیدہ اور خشک ہے لیکن احسان کے کلام میں فرحت مرحوم کو شوخی اور خوش مذاقی اور ہجو کی کافی مثالیں مل گئیں شاید مرحوم کی رعایت سے انھوں نے دل کھول کر ان پر نہیں لکھا ورنہ ان کی شگفتہ مزاجی اس موضوع کو اتنا جلد ختم نہ ہونے دیتی۔

آخر میں ہم مضمون اشعار کی ایک سرخی بھی قائم کی ہے اور اس کے تحت خسرو، آبرو، ذوق غالب اور اکبر کے اشعار اور خیالات سے احسان کے ہم مضمون کلام کا موازنہ کیا ہے۔ اس کے بعد ذوق اور احسان اور نصیر اور احسان کی ہم طرح غزلوں پر بحث کی ہے! اس کام میں تینوں صاحبان کمال کے دیوانوں کی ان کو بڑی چھان بین کرنی پڑی ہوگی۔ یہ حصّہ بہت محنت سے لکھا ہے اور یہ ان کی ادبی تحقیق کا بہت اچھا نمونا ہے۔

(۸)

مضامین فرحت کے سات حصّے طبع ہوے ہیں۔ شاید ان کے ورثا کے یہاں اور مضامین موجود ہوں معلوم نہیں ان میں ادبی تحقیق کا کوئی مضمون شامل ہے یا نہیں۔ بحالت موجودہ نظیر اکبرآبادی پر میرزا صاحب نے جو مضمون لکھا تھا وہ اس سلسلے کی آخری کڑی نظر آتا ہے۔ یہ ان کے مضامین کے آخری یعنی ساتویں حصّے میں شامل ہے اور نصف کراؤن سایز کے دو سو صفحات میں چھپا ہے لیکن اس کا زیادہ حصّہ کلام نظیر کے نمونوں ہی کے نذر ہو گیا ہے اور اس طرح یہ زیادہ تر ایک تعارفی مضمون نا ہے۔

سبب تالیف یہ ہے کہ میرزا صاحب کسی مضمون کے سلسلے میں پروفیسر شہباز کا مرتبہ کلیات نظیر دیکھنا چاہتے تھے اور اس کی تلاش میں ان کو پروفیسر آغا حیدر حسن کے یہاں نظیر کے وہ قلمی دیوان مل گئے جن کی زیارت سے شہباز مرحوم اور دوسرے لوگ محروم رہے تھے حالانکہ ان کی تلاش میں انھوں نے تمام ہندوستان چھان مارا۔ اس غیر متوقعہ کامیابی پر فرحت مرحوم بہت خوش ہوئے اور ان کو اشاعت کے لیے مرتب کر کے انجمن ترقی اردو سے ۱۹۴۲ء میں شائع کرایا اور ان پر دیوان یقین کی طرح ایک مقدمہ بھی لکھا لیکن یہ مقدمہ اتنا بڑا نہیں ہے (صرف ۴۰ صفحات پر مشتمل ہے) اور نہ اس کا تحقیقی معیار ہی اتنا بلند ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نظیر کے بارے میں پروفیسر شہباز نے ہر ممکنہ تلاش و کاوش سے کام لیا تھا اور میرزا صاحب کے کام کے لیے کوئی پہلو باقی نہ رکھا تھا۔ صرف غزلوں کے دو دیوان ان کو نہ مل سکے تھے۔

میرزا صاحب نے ان دیوانوں کے خط، نہج کتابت، اور تصویروں وغیرہ کی خصوصیات پر تحقیقی بحث کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ نسخہ نظیر کے ایک صاحب ثروت شاگرد مہاراجہ بلونت سنگھ نے مرتب کرایا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے نظیر کی شاعری پر مختلف تذکرہ نگاروں نے جو رائیں لکھی ہیں ان پر تبصرہ کیا ہے اور آخر میں نظیر کی غزلوں اور اشعار کی مختلف خوبیوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس حصے کو ذیلی عنوانات میں تقسیم کیے بغیر سرسری طور پر قلمبند کر دیا ہے۔ اس کی نوعیت تحقیقی سے زیادہ تنقیدی ہے۔

فرحت مرحوم نے اسی مقدمے کو بعد میں ذرا پھیلا کر اپنے مجموعۂ مضامین کے ساتویں حصے میں شایع کیا ہے۔ چونکہ مقدمہ غزل کے دیوانوں سے متعلق تھا اس لیے اس میں غزلوں ہی تک ان کا تبصرہ محدود تھا۔ نظیر کی نظمیں جن پر ان کی شہرت اور اہمیت کا دارومدار ہے زیر بحث نہیں آئی تھیں۔ اس لیے میرزا صاحب نے ایک علحدہ مضمون کی ضرورت محسوس کی اور اس میں موضوع کے لحاظ سے نظموں کو تقسیم کر کے ان پر نہایت خوبی سے نظر ڈالی ہے اور مثال کے طور پر ان کے وافر نمونے شریک کیے ہیں۔

سید محی الدین قادری زور

میرزا فرحت اللہ بیگ کی شاعری

میرزا صاحب کا آیندہ مَیں اس مضمون میں پورا نام نہیں لوں گا اور صرف تخلص فرحت ہی سے ان کا ذکر کروں گا۔ اس مضمون کو میں کم و بیش انگریزی زبان میں Poetry society کے ایک جلسے میں پڑھ چکا ہوں اس لیے ایسے سننے والوں کو جو وہاں موجود تھے اگر انگریزی ضرب المثل کے موافق دوسرے وقت کی گو بھی کا مزا آئے یا اردو مثل کے لحاظ سے باسی کڑھی کا اُبال معلوم ہو تو وہ نواب سعید جنگ بہادر یا ان کے لایق بھائی مولوی سجاد میرزا صاحب سے گلا کریں جنھوں نے اصرار سے اس مضمون کو اردو مجلس میں پڑھنے کے لیے مجبور کیا۔ حبیب کا ذکر اگر مکرر بھی ہو تو لطف آتا ہے اس لیے مجھے تعمیل میں کچھ عذر نہ ہوا۔

کسی شاعر کے کلام کی داخلی اور خارجی صفات کو سمجھنے کے لیے چونکہ اس کے واقعات زندگی اور عام کردار سے مدد ملتی ہے، اس لیے میں نہایت مختصر طور سے فرحت کے حالات بیان کروں گا اور ایسے صاحبوں سے جو اُن کی زندگی اور رجحانات سے واقف ہیں اور اس جلسے میں موجود ہیں استدعا ہے کہ وہ مجھے معاف فرمائیں۔

فرحت ۱۸۸۴ء میں دلّی میں پیدا ہوئے ۱۹۰۷ء میں حیدر آباد آئے اور یہیں بس گئے، ۲۶ر اور ۲۷ر اپریل کی درمیانی رات میں وہ اللہ کے پیارے ہو گئے یہ واقعہ ۱۹۴۷ء میں ہوا دلّی میں وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس میں ممتاز شاعر گزر چکے تھے مثلاً مومنؔ، غالبؔ، میر دردؔ اور رنگینؔ۔ میرزا صاحب کے دو چچا بھی شاعر تھے ایک ذاکرؔ تخلص فرماتے تھے دوسرے شاکرؔ دونوں صاحب دیوان ہیں، فرحت کو اس طرح شاعری کا ملکہ میراث میں ملا، لیکن وہ اس ملکے کے جوہر جب تک ان کی عمر خاصی پختہ نہ ہو گئی، دکھا نہ سکے۔ تاہم ان کی طبیعت کی براقی اور خداداد

ظرافت کا پتا بعض ہجوؤں اور قطعوں سے ملتا ہے جو انھوں نے مدرسہ اور کالج کی طالب علمی کے زمانے میں مرتب کیے تھے۔ فرحت جب کالج کی تعلیم سے فارغ ہوئے تو ان مشاعروں میں شریک ہوئے جو خود ان کے مکان پر ہوتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں ایک مرتبہ علی گڈھ بھی مشاعرے میں شریک ہونے کے لیے گئے تھے لیکن خود فرحت نے ایسی شرکت کو محض تفریح سمجھا کیونکہ شاعر بننے کا جذبہ اس وقت تک ان میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ فرحت کو پڑھنے کا بے حد شوق تھا اور اُردو فارسی اساتذہ کا منتخب کلام ازبر یاد تھا۔ خدا نے اُن کو نہایت سُریلی، پاٹ دار آواز دی تھی اور شعرا کے کلام کو سنا کر وہ اپنے دوستوں کو بھی خوش کرتے تھے اور خود بھی محو ہو جاتے تھے۔ فرحت کو حالی کی مسدس کے ساتھ جعفر زٹلی، چرکین اور نظیر کی ہزلیات بھی یاد تھیں، وجہ یہ ہے کہ زمانے کا ذوق ایسا تھا کہ کتب فروش گٹھڑ باندھے ہوئے جب گھر گھر پھیری لگاتے تھے تو راہِ نجات، نور نامہ، ہرنی کا معجزہ، قرآن کے سیپاروں کے علاوہ نظیر کا چوہے نامہ، دیوان جان صاحب، دیوان جعفر زٹلی، دیوان چرکین بھی ساتھ رکھتے تھے اور لوگ انھیں بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ کم عمر بچوں کے ذہن اور رجحانات پر ایسے ادب کا اثر پڑنا لازمی ہے اور فرحت کی نثر اور نظم دونوں میں یہ میلان موجود ہے۔

فرحت سرکار نظام کی ملازمت میں مدرس کی حیثیت سے شریک ہوئے اور اپنی ذاتی قابلیت اور علمی استعداد کی وجہ سے ہائی کورٹ کی ججی کے ممتاز عہدے تک پہنچے۔ فرحت کی شخصیت بحیثیت سرکاری عہدے دار اُن کی خانگی روش سے بالکل جدا تھی۔ خاموش، کم سخن، نپی تلی بات، فرض کا گہرا احساس، انصاف اور حق پسندی اور کام کرنے کا غیر معمولی جذبہ۔ دوستوں میں جب بیٹھتے تھے تو ڈینگ مارنا، فقرے کسنا، ہنسنا اور ہنسانا اور مزاحیہ اور عشقی کی باتیں اُن کی عام عادات تھیں۔ طالب علمی کے زمانے میں پیدل پھرنے کا بہت شوق تھا۔ مجھے یاد ہے کہ دسمبر کا مہینا تھا کڑاکے کے جاڑے پڑ رہے تھے۔ ہم دونوں صبح چار بجے اُٹھے۔ اُوور کوٹ پہنے گلوبند لپیٹے، جیبوں میں چبینا بھرا اور قطب صاحب کی طرف چل نکلے راستے میں گاڑی بانوں کے پاس بیٹھے۔ الاؤ پر آگ تاپی۔ فرحت تو چلم کے دور میں بھی شریک ہوئے۔ گانوں کے حالات پوچھے۔ کنواں مل گیا تو پنہاریوں سے باتیں کیں، ان کے گیت سُنے،

جس روز کا میں ذکر کر رہا ہوں اس روز تغلق آباد کا تاریخی قلعہ بھی دیکھا اور گھر واپس ہونے تک پورے چونتیس میل کی منزل طے کی۔ دس بارہ میل کا تو روز چکّر ہو جاتا تھا۔ دہلی میں جہاں اب دہلی یونیورسٹی ہے اور پہلے لارڈ کرزن نے اپنے قیام کے لیے ایک مختصر عمارت "وایسریگل لاج" کے نام سے تعمیر کی تھی، وہاں کھیت تھے اور فرحت اور اُن کے ساتھ میں بھی وہاں اکثر کچریاں کھانے جایا کرتے تھے، کیونکہ وہاں کی کچریاں بہت مزے دار ہوتی تھیں۔ فرحت کی آنکھیں اور دماغ ایسی سیروں میں ہمیشہ قدرتی مناظر سے لطف اُٹھاتے تھے۔ جغرافیائی اور تاریخی حالات معلوم کرنے کا شوق تھا۔ دیہاتی زندگی بہت پسند تھی اور اسی وجہ سے وہ اپنے ایسے ہم جماعتوں میں بہت عزیز ہو گئے تھے جو گاؤں سے تعلیم کے لیے آئے تھے۔

فرحت کا دل محبّت کے جذبے سے لبریز تھا اس لیے جس سے وہ ایک دفعہ مل لیتے اُن کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں ان کے دوست اور احباب موجود ہیں البتّہ خط وکتابت میں پابند نہ تھے، شاید اس وجہ سے کہ اس کو وہ بہت فضول سمجھتے ہوں ہمیشہ شاد باش و شادزی، پر عمل تھا۔ آخر عمر میں دل کے سخت دورے پڑتے تھے، لیکن ذرا سنبھلے اور پھر وہی ہنسی اور خوش مذاقی، کبھی افسردگی اور تیوری پربل نظر نہیں آتا تھا۔ وہ زندگی کے فلسفے میں ہمیشہ "پر مسرت" نظریے کے صرف قایل ہی نہ تھے بلکہ کاربند بھی تھے۔ موت سے اڑتالیس گھنٹے پہلے اپنے مکان پر اردو مجلس کے جلسے میں جو اپنا تازہ کلام سنایا، اس میں وہی لطافت اور چاشنی تھی جو اُن کی نظم میں ہمیشہ ہوا کرتی تھی۔ آواز بھی وہی زوردار اور گلا بھی ویسا ہی دل کش۔

فرحت چالیس برس کے سن میں ہی ایک مشاق نثر نویس ہو گئے تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد آنجہانی کو ان کے مضامین بے حد پسند تھے۔ اکثر اپنی ڈیوڑھی پر بلواتے تھے اور مضامین کو سن کر دل کھول کر داد دیتے تھے۔ مہاراجہ کو یہ خبر نہ تھی کہ فرحت شاعر بھی ہیں۔ ایک مرتبہ ایسا اتّفاق ہوا کہ ڈیوڑھی میں مشاعرہ ہوا، فرحت نے بھی غزل پڑھی، مہاراجہ سن کر پھڑک اٹھے اور فرمایا، اوہو آپ شاعر بھی ہیں۔ پھر کیا تھا، فرمایشوں کا تار بندھ گیا۔ فرحت اس زمانے میں گلبرگے میں سشن جج تھے، حکم تھا جب بلدہ آؤ تازہ کلام لے کر آؤ اور مجھے سناؤ۔ مہاراجہ کی صحبت میں ہر قسم کے آدمی ہوتے تھے۔ ایک شاعر "بیگم" تخلّص فرماتے تھے اور ریختی لکھتے تھے۔ ان کا کلام ذرا

پھس پھسا ہوتا تھا۔ فرحت سے رہا نہ گیا، جان صاحب کا دیوان انھوں نے بھی بچپن میں پڑھا تھا۔ لیکن فرحت کی مہذب طبیعت نے فحش کو گوارا نہ کیا۔ البتہ اپنی غزلیات میں عورتوں کے جذبات اور محاورے کو خوب ادا کیا ہے۔ میں اس مضمون میں آگے چل کر اُن کی ریختی غزلیات کے نمونے پیش کروں گا۔ مہاراجہ کی قدردانی اور ذوق کے فرحت بہت مدّاح تھے اور کہا کرتے تھے، میں محض نثر نویس تھا مہاراجہ کی قدردانی نے شاعر بنا دیا۔

فرحت نے جو اپنے کلام کا انتخاب "میری شاعری" کے عنوان سے شایع کیا تھا اس میں انکسار کے طور پر اپنے آپ کو تیسرے درجے کے شاعروں میں شمار کیا ہے لیکن اگر ان کی شاعرانہ صنعت گری، زبان کی شادابی اور موزونی، بیان کی صفائی اور بحور و قوافی کے ترنّم کو دیکھا جائے تو ان کا رتبا دوسرے درجے کے شاعروں میں بھی ممتاز نظر آتا ہے۔ میں اس رائے کی تائید میں فرحت کے کلام کے چند نمونے پیش کروں گا، آپ خود اندازہ فرما سکتے ہیں، لیکن ترنّم کے لطف کے لیے اب اُن کا سا گلا کہاں؟

فرحت کی طبیعت ہمہ گیر تھی۔ انھوں نے عشقیہ غزلیات میرؔ اور مومنؔ کے رنگ میں لکھی ہیں۔ صوفیانہ غالبؔ کے طرز میں۔ مزاحیہ اکبرؔ الہ آبادی اور رنگینؔ کے تتبّع میں۔ قومی نظموں میں حالیؔ اور اقبالؔ کا ڈھنگ موجود ہے۔ ہجو کے میدان میں سوداؔ کی پیروی کی ہے اور فطرتِ انسانی مناظرِ قدرت اور سماجی خصوصیتوں کے مرقعے، نظیرؔ اکبر آبادی کی فن کاری کے اسلوب پر تیار کیے ہیں۔ نظیرؔ کے وہ بڑے مدّاح تھے اور ان کو بے حد خوشی ہوئی تھی جب نظیرؔ کے دیوان کا ایک نسخہ پروفیسر آغا حیدر حسن کے کتاب خانے میں ان کو مل گیا تھا، دیوان کو انھوں نے ایک عالمانہ مقدّمے کے ساتھ انجمن ترقی اردو کی اشاعات کے سلسلے میں چھپوا دیا ہے اور وہ اُن کی تنقیدی نظر اور وسیع مطالعے کی ہمیشہ یادگار رہے گا۔ فرحت کے کلام میں جو نظمیں نظیرؔ کے ڈھنگ پر لکھی گئی ہیں اُن میں فرحت کا مخمّس، جمنا کا کنارا، نہایت مقبول ہوا۔ دریائے جمنا کو ہندو مذہب کی روایات میں خاص تقدّس حاصل ہے، پھر دہلی شہر بھی اسی کے کنارے پر بسا ہوا ہے۔ موسمی میلے بھی وہاں ہوتے ہیں اور مختلف اوقات میں مناظرِ قدرت بھی خاص دلکشی رکھتے ہیں۔ فرحت نے ان سب کی تصویریں کھینچی ہیں اور چونکہ وہ دہلی کے رہنے والے تھے اور وطن سے

گہری محبت تھی اس لیے اُن کی صنعت گری میں درد اور روحانیت بھی موجود ہے۔ اب آپ اس نظم کے چند بند سنیے اور داد دیجیے۔ نظم کا عنوان ہے "یادِ وطن"۔

یادِ وطن

اے اہلِ وطن پوچھ نہ یہ مجھ سے خدارا ۔۔۔ دلّی کا بھی ہے یاد تجھے کوئی نظارا
ہے یادِ وطن ہی مرے جینے کا سہارا ۔۔۔ اس شہر کا ہر گوشہ ہے یوں تو مجھے پیارا
آنکھوں میں سدا پھرتا ہے جمنا کا کنارا

چاندنی رات

وہ چاندنی رات اور وہ فضا نور سراپا ۔۔۔ رہ رہ کے وہ پھر بادِ شبک سیر کا جھونکا
پانی کا وہ اندازِ روانی کہ کہوں کیا ۔۔۔ اس منظرِ خاموش میں گھاٹوں کا وہ نقشا
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

اس عکسِ رخِ ماہ میں پانی کا وہ دھارا ۔۔۔ پگھلی ہوئی چاندی تھی کہ بہتا ہوا پارا
اور سطح کو کچھ موج ہوا نے جو اُبھارا ۔۔۔ پھر لہروں کا اُٹھ اُٹھ کے بلانے کا اشارا
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

اور سامنے ہی قلعہ کا وہ منظرِ مایوس ۔۔۔ وہ شمعِ زباں دانی کا ٹوٹا ہوا فانوس
اک حسن کہ ہے چادرِ ویرانی میں ملبوس ۔۔۔ تھا ہند کا پہلے جو کبھی مرکزِ ناموس
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

صبح

مشرق میں اُفق کے وہ چمکدار ستارے ۔۔۔ اور ان میں وہ کرنوں کے پُر از نور شرارے
مغرب میں اُترتے ہوئے وہ ستارے ۔۔۔ دریا کی وہ بیداری وہ موجوں کے طرارے
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

ہر گھاٹ پہ دہلی کے حسینوں کا وہ جھرمٹ ۔۔۔ وہ ساڑیاں ہر رنگ کی وہ ہاتھ کے گھونگھٹ
وہ حسنِ خداداد نہیں جس میں بناوٹ ۔۔۔ قدرت کے تماشائی کا دل جس پہ ہے تو لپیٹ
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

پھر گھاٹ کے نزدیک وہ ڈبکی کا لگانا — گھبرا کے مگر پانی سے جلدی نکل آنا
بھیگی ہوئی ساڑی میں بدن کا وہ چرانا — جھک جھک کے وہ جل ہاتھوں سے سورج کو چڑھانا
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

سادھو کا کہیں بیٹھنا مارے ہوئے آسن — کھینچے ہوئے دنیا کی تمناؤں سے دامن
خاموش مگر ہاتھ میں پھرتی ہوئی سمرن — اور ٹوٹنا لوگوں کا وہاں کرنے کو درشن
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

بڈھوں کا وہ پایاب کنارے پہ اُترنا — اور جوشِ عقیدت سے وہ جل گھنٹی میں بھرنا
بند آنکھیں کیے دل میں دعائیں یہی کرنا — ہے رام ہمارا تو یہیں جینا ہو مرنا
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

اک سمت وہ جلتی ہوئی دو چار چتائیں — شعلوں کی لپک اور دھوئیں کی وہ گھٹائیں
وہ شیون و فریاد کی دل دوز صدائیں — سن کر جنھیں دشمن کے بھی آنسو نکل آئیں
آنکھوں میں وہ پھرتا ہے جمنا کا کنارا

برسات

برسات کے عالم کا نہ کچھ پوچھ فسانا — دریا پہ اُمنڈ آتا تھا سارا ہی زمانا
لہروں کی زبانوں پہ وہ ساون کا ترانا — سنگت میں وہ گرداب لیے چنگ و چغانا
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

بجتا تھا کہیں ڈھول کہیں دف کہیں مرچنگ — چلتا تھا کہیں یاروں میں دورِ مئے گلرنگ
گا نجا کہیں اُڑتا تھا تو چھنتی تھی کہیں بھنگ — تھا سب کا غرض شوق جدا اور جدا رنگ
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

وہ بیلے کے ہر کونے سے موروں کی جھنکاریں — اور آموں پہ کوئل کی وہ کوکو کی پکاریں
وہ ابر کے رنگوں کے بدلنے کی بہاریں — ان اودی گھٹاؤں میں وہ بگلوں کی قطاریں
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

وہ قسمتِ بیدار کے دن اور وہ راتیں — وہ کشمکشِ دہر کے جھگڑوں سے نجاتیں

اور لطف جوانی کا اُٹھانے کی وہ گھاتیں　　فرحت کو نہ بھولی ہیں نہ بھولیں گی وہ باتیں
یاد آئے گا ہر وقت وہ جمنا کا کنارا

تیسرے بند میں "گھلی ہوئی چاندی" اور "بہتا ہوا پارا" اگرچہ انگریزی تشبیہات کے ترجمے ہیں لیکن اُردو میں نئی لطافت پیدا کردی ہے۔ البتہ لہروں کے اُبھار میں اُٹھ اُٹھ کے بلانے کا اشارا فرحت کی جدت ہے اور نہایت نفیس استعارہ ہے۔ چوتھے بند کی تشبیہات بھی نہایت نادر ہیں۔ خصوصاً یہ مصرع "اک حُسن کہ ہے چادرِ ویرانی میں ملبوس" کتنا پاکیزہ اور کیسا موثر انسانی فطرت اور عورتوں کی شرم و حیا کی تصویر چھٹے اور ساتویں بندوں کے ان مصرعوں میں خوب کھینچی گئی ہے۔

وہ ساڑیاں ہر رنگ کی دو ہاتھ کے گھونگھٹ
قدرت کے تماشائی کا دل جس سے ہو تو لپٹ
گھبرا کے نگر پانی سے جلدی نکل آنا
بھیگی ہوئی ساڑی میں بدن کا وہ چرانا

فرحت نقاش تھے لیکن رنگوں اور خطوط کی نقاشی میں ان کی تصاویر ایسی ہو بہو اور دلپذیر نہیں ہوئیں جیسی الفاظ کی نقاشی میں۔ دسویں بند میں بھی جہاں جلتی ہوئی چتاؤں کا ذکر ہے ہندی عورت کی والہانہ محبت اور وفاداری کا عجب دل سوز مرقع پیش کیا ہے۔ بارھویں بند میں الفاظ کے زور اور جذبات کے ہجوم سے نظیر اور قاآنی دونوں کا لطف آجاتا ہے۔ لکھتے ہیں ؎

بجتا تھا کہیں ڈھول کہیں دف کہیں مرچنگ　　چلتا تھا کہیں یاروں میں دیتے کے گل رنگ
گانجا کہیں اڑتا تھا تو چھنتی تھی کہیں بھنگ　　تھا سب کا غرض شوق جدا اور جدا رنگ

فرحت کو قاآنی کا کلام بہت پسند تھا اور اکثر یہ بند دوستوں کو سنایا کرتے تھے۔

من از شراب می خورم بہ بانگ کوس می خورم　　ببارگاہِ تہمتن بہ بزم طوس می خورم
پیالہ ہائے وہ منی علی الرّؤس می خورم　　شراب گیری چشم مے مجوس می خورم
نہ جو گیم کہ خو کنم بہ برگِ کوکنارہا

تیرھویں بند کے اس مصرع میں "ان اودی گھٹاؤں میں وہ بگلوں کی قطاریں" فرحت کی

دل آویز رنگ آمیزی ضرور ہے لیکن یہ تشبیہ عبدالرحمٰن خاں احسان کے اس مصرع میں " ابر میں بگلوں کی جس طرح قطار آئے نظر" پہلے سے موجود ہے اور نظیر اکبر آبادی نے بھی اس تشبیہ کو معشوق کے مسی ملے ہوئے ہونٹوں کی تعریف میں پیش کیا ہے ؎

لب مالیدہ مسی میں دُرِ دنداں کی صفا اس سیہ ابر میں یوں اُڑتے ہیں بگلے جیسے

فرحت نے اودی گھٹاؤں کے تلازمے سے اس تشبیہ کو بڑی رنگینی دے دی۔

اب میں فرحت کی غزلیات پر تبصرہ کروں گا۔ ان کی طبیعت میں درد تھا اور انسانی فطرت اور جذبات کو بھی خوب سمجھتے تھے۔ اسی لیے اُن کے کلام میں غزلیات کی تعداد زیادہ ہے۔ قدما کے رنگ میں بھی لکھی ہیں اور دورِ حاضر کے رنگ میں بھی۔ میر کے طرز پر جو چھوٹی بحروں میں لکھی ہیں وہ بہت مقبول ہوئیں۔ ایک غزل کے چند اشعار جو میر کے رنگ کے ہیں سناتا ہوں ؎

کہتے ہیں ہوشیار ہے اب تک اپنے بیمارِ غم کو دیکھ تو آ

حرماں نصیب عاشق کی آخری دم کی تمنا کو خوب بیان کیا ہے ؎

میرے گھر میں بہار ہے اب تک ہے خزاں اور دل کے زخموں سے

دیکھ وہ سوگوار ہے اب تک موت آچک کہ غیر کے غم میں

اور مجھے انتظار ہے اب تک اُس کے وعدے کو ہوگئے برسوں

عشق کی لگن اور چیٹک کو آخری شعر میں کیسے موثر طریقے سے ادا کیا ہے۔ آخر میں اسی غزل میں کہتے ہیں ؎

جس کا فرحت خمار ہے اب تک کیا زمانہ بھی تھا جوانی کا

ایک اور غزل کے بھی چند شعر سُن لیجیے۔ جن میں فرحت کی اعلیٰ ذہنی صفات نمایاں ہیں ؎

کیا تجھ سے نبھ سکیں گے آئینِ مے پرستی زاہد تو مے کدے میں آجا مگر بتا دے

خاموش ہوگیا ہے گویا کہ سازِ ہستی اس عشق نے بھلا دی سب بزم آفرینی

یہ عاشقی نہیں ہے اے محوِ خود پرستی شہرت طلب ہے شاید آہ و فغاں سے اپنے

اور اب تو غم کے ہاتھوں ویران ہے یہ بستی کیا کیا نہ میر دل میں ارماں بھرے ہوئے ہیں

ہے خوفِ مرگ ہی سے یہ سب بہارِ ہستی کم فرصتی سبب ہے دنیا میں کوششوں کا

فرحتؔ تمھاری حالت کیوں نہ دن بہ دن بگڑے   اتنی بلند نظری اور ایسی تنگ دستی

اس غزل کے پہلے شعر میں حافظ کے رنگ کی جھلک نظر آتی ہے جنھوں نے زاہد ظاہر پرست کی خوب خبرلی ہے۔ دوسرے اور چوتھے شعر میں خارجی محاسن یعنی لفظی خوبیاں ہیں مثلاً دوسرے شعر کے آخری مصرع میں "خاموش" اور "گویا" کا تضاد، اور اسی طرح چوتھے شعر کے دوسرے مصرع میں "ویران" اور "بستی" کا تضاد پانچویں شعر میں مغربی فلسفے کا اثر اور زندگی کی تگ و دو نمایاں ہیں۔ آخری شعر میں دورِ جدید کی شاعری کا رنگ ہے۔ خطاب اپنے سے ہے لیکن متوسط طبقے کی تباہی بیان کی گئی ہے کہ آمدنی کم اور معیارِ زندگی یورپ والوں کا۔

تصوف نے عشقِ حقیقی کے رنگ میں مشرقی شاعری میں ایک خاص جاذبیت پیدا کردی ہے۔ اب میں فرحتؔ کی غزلیات کے ایسے اشعار سناؤں گا جن میں صوفیانہ عقاید موجود ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

اُبلنے لگی جام میں خود شراب   جہاں ذکرِ دُردی کشاں ہوگیا

اس شعر میں عاشقانِ خدا کی محویت کے اثر سے جوشانِ غیر ذی حیات کائنات میں بھی نمودار ہو جاتی ہے اس کی طرف اشارا ہے۔

یہ کعبہ ہے فرحتؔ نہیں بت کدا   بھٹک کر کہاں سے کہاں آگیا

کس طرح منزلِ دُنیوی سے منزلِ حقیقی تک انسان پہنچ سکتا ہے۔ اس کو نہایت لطیف پیرایے میں بیان کیا گیا ہے "بھٹک کر" یہ دو لفظ شعر کی جان ہیں۔ ایک اور غزل میں شاعر کی وسیع مشربی اور ذہنی پس منظر کو دیکھیے۔

کیوں ٹھیر گیا آخر وسطِ رہِ الفت میں   مسجد ہی سے نکلا ہے زاہد رہِ بتخانا

فرحتؔ کی طبیعت بھی اک راز ہے سربستہ   مے کش تو نہیں لیکن کچھ رنگ ہی رندانا

اپنے روحانی جوش کا کس خوبصورت انداز میں اظہار کیا ہے۔ حالیؔ کی مشہور غزل کے تتبع میں یہ شعر ملاحظہ فرمائیے ؂

گرے اپنی نظروں سے ہم خوار ہو کر   ابھی دیکھیں قسمت میں کیا خواریاں ہیں

زمانہ ہے عیش و مصیبت کا چکّر   مگر آگے پیچھے کی یہ باریاں ہیں

قویٰ مضمحل ہو گئے سارے فرحت — یہ چلنے چلانے کی تیاریاں ہیں

آخری شعر میں غالبؔ کے مشہور شعر کا مفہوم آگیا ہے ؎

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ — اب عناصر میں اعتدال کہاں

عشقیہ رمز و کنایے کو اس شعر میں نہایت خوبصورتی سے ادا کیا ہے ؎

نگاہیں اُن کی تصدیقِ محبت کر کے کہتی ہیں — مگر دیکھو کسی سے تم نہ یہ رازِ نہاں کہنا

ایک غزل غالبؔ کے طرز میں بھی سن لیجیے۔ غالبؔ کی بلند خیالی کو پہنچنا ہر شاعر کی قدرت میں نہیں، البتہ اس غزل کے ترنمی اثر کا کیا کہنا ؎

دل مرا روزِ ازل سے بیقرارِ نغمہ ہے — ہر نفس اس کے لیے آوازِ تارِ نغمہ ہے

ہر مصیبت کیا گزشتہ راحتوں کی یاد ہے — نوحہ بھی دیکھو تو گویا یادگارِ نغمہ ہے

ساز کی حاجت نہیں ہے نغمۂ جاں سوز کو — گوشِ اہلِ ذوق کو ہر ساز عارِ نغمہ ہے

گوش بر آوازِ بلبل ہیں یہ سب گل ہائے باغ — شاید ان کو اس فضا میں اعتبارِ نغمہ ہے

جل بجھے پہلو میں دل وہ چیز ہے ساز و سرود — درد کا اس میں جو پردا ہے شرارِ نغمہ ہے

یہ نہیں آوازِ مطرب ہے رواں اک جوئبار — تان جو اس میں ہے گویا آبشارِ نغمہ ہے

ابر ہے ساقی ہے مے ہے اور زمانہ سازگار — چھیڑ مطرب وقت کی ہاں اب بہارِ نغمہ ہے

انقلابِ دہر میں جب رنج و غم کا بھی ہے دَوْر — کیوں دلِ راحت طلب کو انتظارِ نغمہ ہے

میں بلبل فرحت کہاں اس طرزِ غالبؔ میں غزل — یہ مگر روزِ ازل کا ہی خمارِ نغمہ ہے

فلسفیانہ خیالات اور حسنِ بیان کے لحاظ سے فرحت کی یہ غزل بہت مقبول ہوئی اور بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

ہوں مُشتِ خاک لیکن ہستی کی داستاں ہوں — دیکھو تو کچھ نہیں ہوں سمجھو تو اک جہاں ہوں

صد حیف عمر ساری کس بے خودی میں گزری — یہ بھی کھلا نہ مجھ پر میں کون ہوں کہاں ہوں

کس طرح قافلے کے ہمراہ چل سکوں میں — جو اُٹھ کے بیٹھ جائے وہ گردِ کارواں ہوں

جس کی تلاش میں ہیں سارے جہاں کے رہرو — اس بے نشاں کا میں بھی صد لا مسا اک نشاں ہوں

آزادیٔ حقیقی ملتی ہے کس کو بلبل — تو ہے قفس میں اور میں پابندِ آشیاں ہوں

اس غزل میں یہ مصرع لاجواب ہے ع "اُس بے نشاں کا میں بھی دھندلا سا اک نشاں ہوں"
تصوف کے رنگ میں فرحت نے بہت سی غزلیں لکھی ہیں جن میں بعض کو اہلِ ذوق نے بے حد سراہا
ہے مثلاً یہ غزل ؎

کس شان سے ساقی نے میخانے بنا ڈالے | جو ٹوٹے ہوئے دل تھے پیمانے بنا ڈالے
دل کس کا تھا اور ہم نے کس کس کو جگہ دی ہے | اس کعبے میں لاکھوں ہی بتخانے بنا ڈالے
یہ رازِ حقیقت کیا اوروں سے نہ چھپ سکتا | تو نے جو یہ ہم جیسے دیوانے بنا ڈالے
مذہب کے یہ سب جھگڑے بس اس لیے برپا ہیں | سمجھے نہ حقیقت کو افسانے بنا ڈالے
اے پیرِ مغاں ہم ہیں قایل تری جدت کے | مسجد کے نمونوں پر مے خانے بنا ڈالے
مَیں کچھ نہ سہی فرحتؔ اُس قوم کا ہوں لیکن | فغفوروں کے سر جس نے پیمانے بنا ڈالے

اس غزل کے تیسرے اور چوتھے شعر میں حافظ کی مشہور غزل کے ان مصرعوں کے مضمون
کو دہرایا گیا ہے ؎

"قرعۂ فال بنام منِ دیوانہ زدند" اور "چوں ندید ند حقیقت رہِ افسانہ زدند"

البتہ ان دو شعروں میں فرحتؔ کی طبّاعی قابلِ داد ہے ؎

دل کس کا تھا اور ہم نے کس کس کو جگہ دی ہے | اس کعبے میں لاکھوں ہی بتخانے بنا ڈالے
اے پیرِ مغاں ہم ہیں قایل تری جدت کے | مسجد کے نمونوں پر مے خانے بنا ڈالے

فرحت نے عشقِ مجازی کے رنگ میں انسانی فطرت اور فلسفیانہ عقاید کو نہایت موثّر طریق
پر سمویا ہے۔ اس غزل میں ان کے انداز کو ملاحظہ فرمائیے ؎

کیا نزاکت کیا ادا کیا ناز کیا انداز ہے | تیری صورت پر یدِ قدرت کو کیا کیا ناز ہے
ہر نگاہِ ناز گویا تیرِ بے آواز ہے | اس کی ناوک افگنی میں یہ غضب کا راز ہے
حُسن طالب عشق کا اور عشق طالب حُسن کا | تم کو مجھ پر ناز ہے اور مجھ کو تم پر ناز ہے
بے نیازی اور نیرا ناز کچھ ہیں ایک سے | فرق اتنا ہے کہ اس میں سوز اس میں ساز ہے
ہر قدم پر ہوتی ہے سیلِ حوادث پائے بوس | یہ ہماری زندگی ہے جس پہ یہ کچھ ناز ہے
ہاں نہ پوچھ ان مبتلوں کے دل کی کیفیت نہ پوچھ | یہ وہ گنجینہ ہے جس میں دو جہاں کا راز ہے

اے حریصِ زندگی کیوں موت سے ڈرتا ہے تو — زندگیٔ دائمی کا موت ہی آغاز ہے

مجھ کو فرحت شاعری میں دخل تو ہرگز نہیں — ہاں مری غزلوں کا بیشک اک نیا انداز ہے

مقطع میں انداز کے انوکھے پن کو کہہ تو گئے لیکن طبیعت چونکہ حق پسند اور جوہر شناس تھی اس لیے "میری شاعری" میں خود لکھتے ہیں "مقطع میں تعلّی کے علاوہ صریح جھوٹ ہے۔" آگے چل کر لکھتے ہیں "ارادہ ہوا تھا کہ "غزلوں" کی جگہ "شعروں" لکھ دوں، لیکن پھر خیال آیا اس طرح رعب کم ہو جائے گا، اس لیے جھوٹ کو بحال خود رکھنا ہی مناسب سمجھا گیا۔"

فرحت کی شاعری پر جب بحیثیتِ مجموعی نظر ڈالی جاتی ہے تو ظرافت اور شوخی کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فرحت کو خواہ بحیثیت مضمون نویس دیکھیں خواہ بحیثیت افسانہ نگار، خواہ بحیثیت شاعر شوخی اور بذلہ سنجی ان کی طبیعت کا خاص امتیاز ہیں، ان کی ظرافت ایک موج زن دریا تھی جس کی طغیانی بعض اوقات ان کے قابو سے بھی باہر ہو جاتی تھی۔ ان کی مزاحیہ نظموں کی ایک بڑی تعداد عوام میں مقبول ہو چکی ہے بچے اور بوڑھے، مرد اور عورت سب ان کو شوق سے پڑھتے اور سنتے ہیں۔ مدرسے کے لڑکے اپنے جلسوں میں ان کو دہراتے ہیں نفیس طبع لوگ اپنے کتب خانوں اور ملاقاتی کمروں میں ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان نظموں میں ان کے "شکوہ" اور "جواب شکوہ" کو بہت شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ یہ میاں بیوی کی آپس کی لڑائی کی روداد ہے۔ لڑائی کی ابتدا روپے پیسے کی تنگی سے ہوتی ہے لیکن بدمزگی آخر میں بہت بڑھ جاتی ہے اور دونوں ایک دوسرے سے علیحدگی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ آخر میں دوستوں اور عزیزوں کی نصیحت کام آتی ہے جو مذہبی اور سماجی ذمہ داریوں کو دونوں کو سمجھاتے ہیں۔ یہ نظمیں چونکہ بہت لمبی ہیں اس لیے آج کی مجلس میں ان کا پڑھنا ممکن نہیں، لیکن "میری شاعری" میں یہ دونوں نظمیں شایع ہو چکی ہیں اور میں ظرافت پسند بہنوں اور دوستوں سے کہوں گا کہ وہ ان نظموں کو ضرور پڑھیں۔ اس وقت میں ایک اور نظم سناؤں گا جس سے آپ کو ان کے مذاق کی پاکیزگی اور بے ساختہ پن کا اندازہ ہو سکے گا۔

کیا اسی واسطے پیدا ہوئے سنسار میں ہم — کہ دھرے جائیں سدا عشق کی بیگار میں ہم

اس بُری طرح پھنسے مجمع اغیار میں ہم　　گھٹ کے دم مر ہی گئے کوچۂ دلدار میں ہم
شکل تو ایسی ہے واللہ کوئی مُنہ نہ لگائے　　کچھ عجب ٹھاٹھ سے ہاں چھپتے ہیں اخبار میں ہم
ہم نے مانا کہ سنہ اُنیس کی ہی فورڈ سہی　　کہیں جاتے ہیں جاتے ہیں مگر کار میں ہم
چھیڑ خانی سے حسینوں کی نہ باز آئیں گے　　کیا ہوا گر کبھی پٹ بھی گئے بازار میں ہم
مان لیتے ہیں کہ ہم شکل میں گلفام نہیں　　کچھ بُرے بھی نہیں یوں دیکھو تو دو چار میں ہم
لوگ سمجھیں کہ بھئی یہ تو بڑے عالم ہیں　　بیٹھے رہتے ہیں کتابوں کے اُٹمبار میں ہم
شوق میں ڈانٹ تو لیتے ہیں پٹھانوں کا لباس　　ہاں نظر آتے ہیں کچھ ریچھ سے شلوار میں ہم
کیا غضب ہے کہ عدو رولز روائس میں پھریں　　اور گھسٹتے پھریں ٹوٹی ہوئی اک کار میں ہم

اس نظم میں دو تین مصرعے نہایت عمدہ ہیں ایک تو یہ "کچھ عجب ٹھاٹھ سے ہاں چھپتے ہیں اخبار میں ہم"۔ اول تو انسانی طلب شہرت کے جذبے کا خاکا اُڑایا ہے، دوسرے اس دھوکے کو رفع کیا ہے کہ کس طرح فوٹو کے نیگیٹو کی تراش خراش سے بدصورت خوبصورت بن جاتے ہیں۔ 'کچھ عجب ٹھاٹھ' کے الفاظ نے مصرعے کی زبان میں بڑی لطافت پیدا کر دی ہے۔

دوسرا مصرع جو شوخی اور ظرافت کی جان ہے یہ ہے۔ "کیا ہوا گر کبھی پٹ بھی گئے بازار میں ہم"۔ ایک مصرع میں "اٹمبار" کا لفظ بھی بہت پر لطف ہے۔

پہلے تذکرہ نویس جب کسی شاعر کی ہمہ گیر طبیعت کی تعریف کرتے تھے تو اکثر یہ جملہ لکھا کرتے تھے۔ "بر ہمہ اصناف سخن قادر بود" یہ رائے فرحت کی شاعری کے تنوع پر پورے طور سے صادق آتی ہے۔ انھوں نے غزلیں لکھیں، مزاحیہ اور قومی نظمیں لکھیں، قصاید لکھے مرثیے لکھے، رباعیاں اور مناجاتیں لکھیں، ہجو لکھی اور تاریخ گوئی کو بھی نہ چھوڑا۔ میں جب یورپ کے پہلے سفر سے ۱۹۲۳ء میں واپس آیا تو فرحت نے بڑے زور کا عصرانہ دیا اور ایک تاریخ بھی نظم کی۔ چونکہ وہ خود میرے بارے میں ہے اس لیے میں اُس کی تعریف نہیں کر سکتا البتہ "میری شاعری" میں آپ اس کو ملاحظہ فرما سکتے ہیں اور داد دے سکتے ہیں۔ ہجو کی طرف فرحت کی طبیعت قدرتاً مایل تھی لیکن ان کا مذاق پاکیزہ تھا اور کلام میں کسی قسم کا ابتذال

نہیں ایک بناوٹی مولوی کی ہجو لکھی ہے، وہ آپ بھی سُن لیجیے، آمد، تازگی اور شاعرانہ ترصیع کاری ملاحظہ ہو ؎

ہجو

ایک صاحب ہیں مولوی صورت — ان کو مذہب سے ہے مگر نفرت
سب انہیں مولوی تو کہتے ہیں — پر وہ مذہب سے دور رہتے ہیں
ان کو مذہب سے کیا تعلق ہے — اُن کا مذہب فقط تملق ہے
کب ہے ایسی کسی میں شان کہیں — سر کہیں مُنہ کہیں ہے کان کہیں
ان کی صورت بھی کیا تماشا ہے — گویا پچکا ہوا بتاشا ہے
ہائے چہرے پہ کیا رونق ہے — آدمی کیا ہے بس حوتق ہے
کالی رنگت بہار دیتی ہے — بھینس سے بھی خراج لیتی ہے
آنکھیں چھوٹی ہیں ناک ہے موٹی — گال جیسے جلی ہوئی روٹی
چھاج سی ڈاڑھی ایسی ان کی ہے — جیسے روئی کسی نے دھنکی ہے
یا کہیں آپ اس کو بے وسواس — کالی مسجد پہ خشک ہو گئی گھاس
موچھیں ٹھوڑی تک ان کی آتی ہیں — اور اُڑ اُڑ کے مُنہ میں جاتی ہیں
جوش میں جب کبھی یہ آتے ہیں — اپنی موچھوں کو کھائے جاتے ہیں
مونچھ مُنہ میں اگر نہیں جاتی — پھر تو ڈاڑھی کی آتی ہے باری
ناک یہ مُڑ کے مُنہ پہ آئی ہے — پھکنی چولھے پہ یا جھکائی ہے
تر نوالا کہیں جو یہ پائیں — کتے کی طرح لوٹ ہی جائیں
میوے آجائیں گر نظر ان کو — پھر نہیں رہتی کچھ خبر ان کو
اس طرح دونوں گلے بھرتے ہیں — جس پہ لنگور رشک کرتے ہیں
اب ذرا ان کے دیکھیے اطوار — ایسے اطوار پر خدا کی مار
شہر سے دُور دُور رہتے ہیں — ان کو گیدڑ بھی تو کہتے ہیں
دُور جنگل میں اک ٹھکانا ہے — گویا اُلو کا آشیانا ہے

ساری دنیا پہ تنگ دستی ہے   دولت ان کے ہی گھر برستی ہے
خوش مذاقی سے ان کو کام بھلا   اور ظرافت کو جانے ان کی بلا
گالیوں پر اُتر ہی آتے ہیں   بے نقط ان کو پھر سناتے ہیں
اب کوئی لاکھ ان کو سمجھائے   نہیں ممکن سمجھ میں کچھ آئے
کب کسی کی یہ بات مانتے ہیں   سب ہی بیہودہ ان کو جانتے ہیں
کون پرواہ ان کی کرتا ہے   گالیوں سے ضرور ڈرتا ہے

میں نے اس مضمون کے شروع میں فرحت کے ریختی لکھنے کا بھی ذکر کیا تھا۔ اس کا بھی نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔ زبان کے لوچ، نسوانی خیالات اور چوچلے کو دیکھیے اور دل کھول کر ہنسیے۔ بی ہمسائی سے میاں کی شکایت ہو رہی ہے ؎

لڑاکا میں سہی اچھا پھوہڑ بھی اب سہی مانا   مگر یہ بھی تو دیکھو حال کیا ہے خود بدولت کا
تھکی کہہ کہہ کے میں ان سے کہ چھوڑ اپنی یہ باتیں   نہیں جاتا بُوا جب پڑ گیا چسکا بُری لت کا

ایک موقع پر جب بال بچا ہونے کے جلد آثار ہیں تو بی ہمسائی سے یوں مخاطب ہیں۔

دین ہے اُس کی آج دے کل دے   میں نے دائی مگر بلالی ہے

اس شعر میں عورتوں کے روزمرہ کو نہایت صفائی سے ادا کیا ہے۔ فرحت کا مذاق ریختی میں بھی نہیں جاتا لکھتے ہیں ؎

میری ہمسائی یوں تو کالی ہے   پر بُوا کیا سلیقے والی ہے

بازار میں پھرنے والی عورتوں کی گفتگو کا اس طرح حق ادا کیا ہے ؎

رستے میں دن دھاڑے فرحت نے مجھ کو چھیڑا   میں نے بھی غل مچا کر سر پر اُٹھائی بستی

فرحت کا مشرب نہایت وسیع تھا اور جب وہ دارانا فسادات کا حال سنتے تھے تو انھیں بے حد صدمہ ہوتا تھا۔ دتی سے انھیں بے حد محبت تھی اور اگر زندہ رہتے تو وہاں کی بربادی کی دلخراش داستان سے خبر نہیں کتنا رنج ہوتا۔ اب میں چند اشعار ایک نظم کے سناتا ہوں جو انھوں نے فسادات اور قتل و خون سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ رنگ مزاحیہ ہے ہر شعر میں درد اور طنز کو نہایت کمال سے سمویا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

جہاں میں ہوں

نہ پوچھ اس شہر کی حالت تو اے ہمدم جہاں میں ہوں
کہ ہر گھر پر چڑھے ہیں جنگ کے پرچم جہاں میں ہوں

سدا چلتی ہیں چھریاں اور سدا چاقو نکلتے ہیں
ہمیشہ رہتا ہے بس ہو کا اک عالم جہاں میں ہوں

پہننے کے لیے ڈھونڈے بھی ملتی نہیں کھادی
جلا ڈالا ہے لاکھوں گز مگر ریشم جہاں میں ہوں

کبھی ہے جیپ کی پوں پوں کبھی ہے توپ کی گھڑ گھڑ
کبھی ہے فوجیوں کے پاؤں کی دھم دھم جہاں میں ہوں

اذاں کیسی کہاں کے سنکھ، کیسے چرچ کے گھنٹے
بڑین کی ہاں مگر آواز ہے ہر دم جہاں میں ہوں

ہے نافذ کرفیو آڈر کھڑی ہے فوج سڑکوں پر
مگر پھر بھی مچا رکھا ہے اک اودھم جہاں میں ہوں

یہاں پتھر چلے، لاٹھی چلی، گولی چلی پہلے
مگر اب پھینکتے ہیں آنسوؤں کے بم جہاں میں ہوں

کہیں سڑکوں پہ زخمی ہیں کہیں گلیوں میں لاشیں ہیں
سمندر پہ کسی کا ٹوٹتا ہے دم جہاں میں ہوں

ہے بجلی بند ٹیلیفون سب بے کار ہیں بالکل
کہ ٹوٹے ہیں یہاں سے وائر تلک سب کھم جہاں میں ہوں

یہاں چھوٹے بڑے جتنے ہیں سب چکر میں آئے ہیں
اُٹھائے پھر کسی کا کون آخر غم جہاں میں ہوں

نہ گھر میں اب جواں ہی ہے نہ بڈھا ہے نہ بچا ہے
کسی کا کوئی آخر کیوں کرے ماتم جہاں میں ہوں

یہاں کی دیکھ کر حالت فلک کا دل بھر آیا ہے
نہیں ساون برستا روتا ہے موسم جہاں میں ہوں

کچھ ایسے زندگی سے آ گئے ہیں تنگ مرد و زن
کہ اب کرنے لگے ہیں موت کو ویلکم جہاں میں ہوں

جدھر دیکھو اُدھر گڑبڑ جہاں جاؤ وہاں شورش
غرض میں کیا کہوں بس ناک میں ہے دم جہاں میں ہوں

یہاں مرنا بہت آسان ہے اور جینا مشکل ہے
غنیمت ہے کہ میں جیتا ہوں "تا اینِ دم" جہاں میں ہوں

مصیبت کون سی ہے جو یہاں نازل نہیں ہوتی
ہے قصہ مختصر ہر وقت "می نالم" جہاں میں ہوں

نہ کپڑا تن کے ڈھکنے کو نہ روٹی پیٹ بھرنے کو
مگر پھر جی رہا ہوں "در چنیں عالم" جہاں میں ہوں

یہاں کے شور و شر سے اب تو یہ وحشت ہوئی فرحت
کہ اپنے آپ کو بھی "من نمی دانم" جہاں میں ہوں

دلّی میں بارش نے مہاجرین پر جو پرانے قلعے کے کھلے میدان میں پڑے ہوئے تھے جو مصیبت ڈھائی تھی اُس کے لیے یہ دو شعر حسب حال ہیں ؎

یہاں کی دیکھ کر حالت فلک کا دل بھر آیا ہے　　نہیں ساون برستا روتا ہے موسم جہاں میں ہوں
کچھ ایسے زندگی سے آ گئے ہیں تنگ مرد و زن　　کہ اب کرنے لگے ہیں موت کو ویلکم جہاں میں ہوں

فرحت کی شاعری کی خاص خوبیاں ان کی زبان کی شستگی، ان کے بیان کی صفائی اور اُن کی پاکیزہ ظرافت ہیں۔ موجودہ زمانے کے شاعروں میں شاید کم ایسے نکلیں جو ان محاسن کلام میں فرحت کا مقابلہ کر سکیں اور انہی خوبیوں کی وجہ سے ان کا نام مجھے اُمید ہے اردو ادب کی تاریخ میں عرصے تک باقی رہے گا۔ خدا اُن کی مغفرت فرمائے۔

غلام یزدانی

اخباروں اور رسالوں کے تراشے

ادیب کی موت

اخبارات نے یہ بڑی ہی رنجیدہ خبر سنائی کہ اردو کے مشہور و ممتاز ادیب، صاحب طرز انشاپرداز میرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی، حیدرآبادی ۲۷ اپریل ۱۹۴۷ء کو دفعتاً اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف منتقل ہو گئے۔ اردو میں لکھنے والے اور خاصے دلچسپ لکھنے والے اس وقت سینکڑوں کی تعداد میں ہیں ان میں سے صحیح و فصیح ٹکسالی، معیاری زبان لکھنے والے صرف چند ہیں اور ان چند میں ایک ممتاز اور نمایاں مقام میرزا صاحب کا تھا۔ سلیس و شگفتہ طرز نگارش کے مالک، اور شوخ نگاری کے تو بادشاہ تھے اُن کے طرز خصوصی میں کوئی ان کا شریک و ثانی نہ تھا پھر مشرقی وضعداری اور اسلامی شرافت کے شیدائی۔ مضامین فرحت کی جلدیں اردو ادب و نثر نگاری کی تاریخ میں اُن کا نام تازہ و سرسبز رکھیں گی۔ حق تعالیٰ انھیں مغفرت و درجات عالیہ نصیب کرے۔

اخبار "صدق"

مولانا عبدالماجد دریابادی کا خط

فرحت اللہ بیگ مرحوم کے کمالات ادبی پر اظہار اور میں کرنے بیٹھوں!

اس حوصلے کو دیکھیے اور ہم کو دیکھیے!

ایسے مستند ادیب، مسلم انشاپرداز، ٹکسالی اہلِ زبان پر مجھ جیسے کم سواد دیہاتی کو لب کشائی کی دعوت دے کر کہیں آپ مجھے بنا تو نہیں رہے ہیں؟ سورج کو لالٹین کی مدد سے، آپ ہی بتائیے

آج تک کس نے دیکھا ہے، جانا ہے، پہچانا ہے؟

اردو میں اچھے دلچسپ لکھنے والوں کی ماشاءاللہ کمی نہیں۔ کمی صحیح اردو لکھنے والوں کی ہے۔ میرزا مرحوم کا شمار اس مختصر، چیدہ، جماعت ہی میں نہیں، اس کی صفِ اول میں ہے۔ ان کی تحریروں کے عنصر خصوصی آپ سننا چاہتے ہیں۔ سنیئے۔ یہ چار تھے۔

۱۔ سلاست،
۲۔ لطافت،
۳۔ حلاوت،
۴۔ ظرافت،

(چاروں کو ساتھ ملا کر پڑھیے، تو خود ایک مصرعہ تیار ہو جائے!)

دل بار بار پڑھنے اور داد ہی دینے کو نہ چاہتا، رشک بھی آ جاتا تھا! دلی کے تھے لیکن بعض اور دلی والوں کی طرح محاورات کی بھرمار کر دینے والے نہ تھے۔ زبان ہاتھی کی سنہری مرصع جھول کی طرح نہ تھی، کہ بھاری بھر کم ہو۔ نرم و نازک تھی، جیسے ریشم۔ لطیف تھی جیسے ہلکی ہلکی شبنم، شگفتہ تھی جیسے پھول کی کلی۔ شیریں تھی جیسے مصری کی ڈلی!

حسن و عشق کے کھیل کھیلتے، لیکن بازاریت کے قریب جب بھی نہ گزرتے۔ ہنسی، چہل، مزاح اور دل لگی کی چیز مہیا رکھتے۔ لیکن ابتذال کا سایا بھی نہ پڑنے دیتے۔ ہنساتے، گدگداتے، کبھی کبھی چٹکی بھی لے لیتے۔ لیکن ظرافت اور تمسخر کی درمیانی حدوں کو کہیں سا بھی نظر سے اوجھل نہ پڑنے دیتے۔

اپنی تحریروں کی سطر سطر میں فرحت مرحوم مشرقی تھے، مسلمان تھے، شریف تھے اور اچھے، بلکہ بڑے ہی اچھے انسان تھے۔

میرزا فرحت اللہ بیگ غفراللہ لہ

دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم پائی۔ لیکن چالیس برس سے حیدرآباد میں آ گر بس گئے تھے اور ان کی شخصیت ایسی مقبول ہو گئی تھی کہ حیدرآباد والے ان کو اپنا ہی سمجھنے لگے تھے۔ عرصے سے قلب کے عارضے میں مبتلا تھے، لیکن یہ مرض کی مطلق پروا نہ کرتے تھے۔ جب درد کی شدت

ہوتی تھی سینہ دبا کر بیٹھ جاتے تھے اور ذرا افاقہ ہوا اور پھر وہی علمی مشاغل۔ گزشتہ مہینے میں بھی چار مضمون لکھے۔ ایم۔اے کے ایک مقالے کی جانچ کی، بڑی عمدہ رپورٹ لکھی۔ جمعہ کے روز خود ان کے مکان پر اردو مجلس کا اجلاس ہوا۔ ایک تازہ غزل اور نظم اپنی دل کش پاٹ دار آواز میں پڑھی ہفتے کی شام کو حسب معمول نظام کلب گئے، وہاں بے تکلف دوستوں سے غپ شپ کی، حالات حاضرہ پر بحث ہوئی۔ ساڑھے نو بجے شب کے مکان واپس آئے، کھانا کھایا، باہر صحن میں سو رہے۔ صبح کو پوتی نے جو دیکھا تو دادا ابا کا چہرا غیر معمولی طور پر زرد نظر آیا۔ وہ دوڑی چچا کے پاس گئی۔ یہ ڈاکٹر ہیں، انھوں نے باپ کو آکر دیکھا تو روح پرواز کر چکی تھی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ یہ واقعہ ۲۶ اور ۲۷ اپریل کی درمیانی رات میں ہوا۔ چونسٹھ برس کی عمر پائی۔ مدرسے میں انعام حاصل کیے، کالج میں بھی امتیاز کا سلسلہ جاری رکھا، کرکٹ کے بھی اچھے کھلاڑی تھے خصوصاً گیند اندازی میں کمال تھا۔ حیدرآباد میں مدرس کی حیثیت سے آئے اور جج کی حیثیت سے وظیفۂ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوے۔ آخر میں دو ہزار ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ خاندان کی بھی جائداد تھی۔ انکسار اور کنبہ پروری ان کی خاص صفات تھیں طبیعت نہایت سادا لیکن اتنی غیور کہ بادشاہوں کے سامنے بھی ذاتی اغراض کے لیے سر خم نہ ہوتا تھا طبیعت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، اس لیے اپنی باتوں سے دوستوں کو خوب ہنساتے تھے۔ نظم اور نثر دونوں میں مزاح کا رنگ موجود ہے، زبان کی لطافت اور حسن ادا کا کیا کہنا جس مضمون کو لیا اسے ایسی خوبی سے بیان کیا کہ پڑھنے والوں اور سامعین دونوں کی زبان سے بے ساختہ واہ واہ نکل جاتی تھی۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی رسالہ ہو جس میں ان کے مضمون نہ چھپے ہوں۔ مجلدات کی صورت میں سات حصے شایع ہو چکے ہیں مستقل کتابیں جو اکثر شعرا کے کلام سے متعلق علٰحدہ ہیں۔ ان کی رائے بے لاگ، مطالعہ وسیع اور دلیل محکم ہوتی تھی۔ بڑے مضامین میں "دہلی کا آخری مشاعرہ" اور "پھول والوں کی سیر" ان کی ہمیشہ کی یادگار رہیں گے۔ چھوٹے مضامین میں "ہیضے کی پہلی تاریخ" حیدرآباد کی خانہ داری کا آئینہ ہے۔ نظموں میں "جمنا کا کنارا" اور غزلیات میں میر کی طرز کی چھوٹی بحر کی غزلیں لاجواب ہیں۔ ہر فن مولا، مصوری بھی کرتے تھے ان کی موت ایک نقصان عظیم ہے۔ ملک سے ایک مشاق ادیب رخصت ہوا۔

اولاد نے ایک شفیق باپ کو کھویا، بیوی ایک چاہنے والے خاوند سے بچھڑ گئی، دوستوں سے ایک ہنس مکھ رفیق جدا ہوا۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

کل من علیھا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام ۵

غلام یزدانی (رسالہ ساقی)

میرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی کی وفات

تمام ہندوستان کے ادبی حلقوں میں اس خبر سے رنج و الم ہوگا کہ دہلی کے مشہور ادیب فرحت الملک میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے حیدرآباد میں وفات پائی۔ دلّی کے پرانے لکھنے والوں میں بھی اور نئے لکھنے والوں میں بھی ان کا درجہ سب سے بڑا تھا۔ اگرچہ انھوں نے دہلی میں رہنا چھوڑ دیا تھا اور حیدرآباد میں سکونت اختیار کر لی تھی لیکن دہلی کا ہر ہندو مسلمان ان کی ادبی قابلیت اور شگفتہ اور مؤثر نظم و نثر کی خوبیوں پر فخر کرتا رہتا تھا۔ افسوس دہلی کا یہ چراغ ایسے وقت میں گل ہوا ہے جب کہ یہاں کی تاریکیوں میں اس چراغ کے روشن رہنے کی بہت زیادہ ضرورت تھی۔

مرحوم نے مرنے سے کچھ دن پہلے میری نسبت جو مضمون بھیجا تھا افسوس ہے۔ وہ اُن کی زندگی میں شایع نہ ہوسکا۔ لیکن خدا نے چاہا ۲۴ر مئی کی منادی میں شایع کر دیا جائیگا۔

اخبار "منادی"

غم ناک خبر

آج روزانہ اخبار انقلاب لاہور میں فرحت الملک میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کے انتقال کی خبر پڑھ کر بہت زیادہ صدمہ ہوا۔ وہ دل کی بیماری میں مبتلا تھے اور دل کی حرکت بند ہونے سے انتقال ہوا۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت کرے اور پس ماندوں کو صبر دے۔ وہ دلّی کے لکھنے والوں میں مجھ سمیت سب سے اچھا لکھنے والے تھے۔

حسن نظامی

آکا فرحت

آکا فرحت شہر بربادی کے بعد پیدا ہوئے اور شہر بربادی سے کچھ پہلے جنت کو سدھارے
قوم کے مغل تھے، صورت کے بھی مغل تھے اور سیرت کے بھی۔ سُرخ و سفید رنگ، سُرخی ایسی جیسے
بخارا کا شفتالو، کشیدہ قامت، چوڑا سینہ، پتلی کمر، ہاتھ پاؤں متناسب، آنکھیں گویا نینو کی
پھانکیں جیسی لیکن انتہا کی نورانی، ذہانت بڑی برستی تھی، مسکراتا چہرہ، گفتگو کا انداز بانکا۔ جھوم
جھوم کر چلتے، ملنے والوں سے دل سے ملتے۔ دلّی کے مشن کالج میں تعلیم پائی، دلّی کے رہنے والے
تھے لیکن خاندانی سلسلے نے حیدرآباد کی خدمت کو ترجیح دی۔ انگریزی کی نوکری نہ کی اس لئے
حیدرآباد چلے آئے اور یہیں بس گئے۔ ان کا پورا زمانہ ملازمت بڑی نیک نامی سے گزرا جو ایک
دفعہ ان سے مل لیتا، بس ان کا دم بھرنے لگتا۔ درباداری سے گریز کرتے تھے، صرف ان امیروں
سے یاد اللہ تھی جہاں ان کے ادبی مذاق کی چاشنی میں اضافہ ہو سکے۔ ادبی شہرت انھوں نے
حیدرآباد ملازمت میں آکر حاصل کی۔ ان کا پہلا مضمون، جو میں نے ان ہی کی زبانی سُنا، وہ
"پھول والوں کی سیر" تھی۔ محترم غلام یزدانی صاحب سابق ناظم آثار قدیمہ نے اپنے چند ملنے
والوں کو چائے نوشی کی دعوت دی، اس میں مجھے بھی یاد فرمایا، چائے بھی پی اور مضمون بھی
سُنا۔ قرنوں گزرنے کے بعد بھی ان کا لب و لہجہ وہی آکا بھائیوں کا سا رہا۔ اس پر بیرونی اثر مطلق
نہ پڑا۔ زبان ٹھیٹ دلّی کی ٹکسالی تھی، خیالات سلجھے ہوئے اور مضمون میں ترتیب خوب ہوتی تھی۔ دلّی
کی آخری شمع یہ بھی ان کا مضمون ایسا ہے کہ جس کے پڑھنے سے شہر آبادی کی تصویر آنکھوں میں
پھر جاتی ہے۔ اس مشاعرہ کو انھوں نے مجبور ہو کر غیر طرحی لکھا، کیونکہ کوئی مشاعرے کا گلدستہ
ایسا نہ ملا جو سن ستاون کے انقلاب سے پہلے کا ہو۔ تصویر انھیں کھینچنی تھی، رنگ تیار رکھے،
پیالیاں ایک قامت کی نہ سہی، مختلف گھاٹ کی اور چھوٹی بڑی ہی سہی، تصویر تو لاجواب
انھوں نے تیار کر دی۔ شمس العلماء مولانا نذیر احمد مرحوم کی جو کہانی لکھی ہے وہ ایسی ہے کہ
اس کی مثل نہ انگریزی میں کوئی ویسی مختصر اور چلتی پھرتی زندہ تصویر میری نظر سے گزری نہ کسی اور

مشاہیر کی سوانح عمریاں لکھنی شروع کر دیں۔ انگریزی میں بھی حیرت ہوتی ہے کہ اس مضمون کے بعد دو سوانح عمریاں ملکۂ وکٹوریہ کی اور ان کے شوہر شہزادہ البرٹ کی اسی رنگ میں لکھی گئیں۔ اردو میں تو "بزم اکبر" اسی مضمون کی رہین منت ہے۔ محبّی قمرالدین صدیقی صاحب نے اس کا اعتراف کر کے یہ "بزم اکبر" آراستہ کی ہے۔ مقدمہ نویسی میں اردو ادب میں کوئی مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو کا مدّمقابل نہ تھا لیکن دیوانِ یقینؔ، دیوان نواب حافظ عبدالرحمٰن خان احسانؔ اور نظیر اکبر آبادی کے کلام پر جو انھوں نے مقدمے لکھے وہ بے مثل اور لاجواب ہیں۔ ہر پڑھے لکھے اور علمی مذاق رکھنے والے کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ جہاں قانون اور تعزیرات ہند کا مذاق اڑایا ہے، وہ نواب کتّے مار خاں کی ڈائری کے چند اوراق ہیں جو ان کے دبے ہوئے طنز کا پتا بتاتے ہیں۔ بلا کے زود نویس تھے، بے تکان لکھتے چلے جاتے تھے، پندرہ بیس برس میں سات جلدیں ان کے مجموعہ مضامین کی شایع ہو گئیں اور اکثر ان کے مضامین ہندوستان کی مختلف جامعوں میں شریک نصاب کئے گئے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت کی دوستی میں نظم کی طرف توجہ کی اور خوب کہنے لگے۔ تھوڑے ہی عرصے میں اتنا کہہ ڈالا کہ ایک کلیات مرتّب ہو جائے۔ اپنا کلام لحن سے پڑھتے تھے خود بھی مزے لیتے جاتے تھے اور سننے والوں پر بھی اثر ڈالتے۔ نمازی پرہیز گار تھے، کبھی دل آزاری کی باتیں نہ کرتے۔ مرنجان مرنج، خود خوش رہتے اور دوسروں کو خوش رکھتے ہیں نے انھیں کبھی کسی کی برائی کرتے نہ سنا اور نہ کسی سے کبھی ان کی برائی سنی۔ بڑی صاف ستھری زندگی تھی۔ کتابوں کے معاملے میں بڑے محتاط تھے۔ اکثر مجھ سے قلمی کتابیں لے کر چلے گئے، برسوں گزر گئے اور میں بھول گیا، جب کام ہو جاتا جوں کی توں پہنچا دیتے۔ میرا کتاب خانہ ان کے لئے ہر وقت کھلا تھا، اور میں بے وسواس کتابیں ان کے حوالے کر دیتا۔ بڑے پابند وضع تھے، جس سے جو طریقہ ملنے کا رکھا اس کو آخر دم تک نبھایا۔ جس صحبت میں جا بیٹھتے ہر شخص ان کی طرف متوجہ ہو جاتا، اور اپنی دل پذیر گفتگو سے ہر ایک کا دل موہ لیتے۔ کبھی کسی کو کوئی تکلیف نہ دی۔ حد ہے کہ بیمار بھی اسی لئے نہ پڑے کہ تیمارداری کی لوگوں کو تکلیف کہیں نہ ہو۔ اگر بیمار پڑتے تو ہار ایسا تھا کہ برسوں گھلنے میں لگتے، یکایک آرام کی نیند سو گئے اور اپنے دوستوں کو سوگوار چھوڑ گئے۔ اللہ پاک اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین! آغا حیدر حسن (رسالہ الموسیٰ)

میرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم

ہمیں میرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کے انتقال کی خبر سن کر بہت افسوس ہوا۔ مرحوم کا معتمدی امورِ عامہ میں اور عدالت العالیہ میں ایک طویل دور ملازمت رہا۔ سبکدوشی کے وقت وہ انسپکٹنگ افسر عدالت العالیہ تھے انھیں شہرت اُردو ادیب کی حیثیت سے حاصل ہوئی عظمت اللہ خاں صاحب مرحوم کا اردو ادب پر یہ بڑا احسان ہے کہ انھیں کے ایماء اور اصرار سے ایک بہترین ظرافت نگار نصیب ہوا۔ اور "آغا فرحت" نے "میرزا الم نشرح" کے نام سے مزاحیہ مضمون لکھنے شروع کئے جو جلدی قبول عام کی سند حاصل کر گئے۔ ان کا طرز تحریر بہت سادہ شگفتہ اور دل کش ہوتا تھا ان کے بیشتر مضامین ہمارے معاشرے کے تقریباً ہر پہلو پر بڑی پر لطف تنقیدیں ملتی ہیں۔ مزاحیہ مضامین کے علاوہ انھوں نے بعض اردو شعراء دردؔ اور نظیر اکبر آبادی پر مقالات شائع کر کے تنقیدی صلاحیتوں کا ثبوت بھی دیا تھا۔ ان کے دو ابتدائی مضامین "یادگار مشاعرہ" اور "پھول والوں کی سیر" اردو ادب میں نقش دوام ثبت کر گئے ہیں انھوں نے مضامین کے کئی مجموعے یادگار چھوڑے ہیں جن میں سے دو ایک بعض جامعات کے اردو نصاب میں شامل ہیں گو چند سال سے انھوں نے لکھنا بہت ہی کم کر دیا تھا لیکن جو کچھ انھوں نے پہلے لکھا اس کی بدولت ان کا نام تاریخ اردو ادب میں محفوظ ہو گیا ہے۔ ان کا شمار اردو کے چوٹی کے مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ پرانی تہذیب کے دلدادہ اور نمائندہ تھے اس لئے فرحت کی فرحت میں ظرافت میں جدید مغربی رنگ کی بجائے ٹھیٹ مشرقی روح مزاح پائی جاتی ہے جس کی سادگی اور البیلاپن اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مرحوم نہ صرف ادیب تھے بلکہ شاعر بھی تھے اور قدیم رنگ میں اور کبھی کبھی اپنے مخصوص ظریفانہ رنگ میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ بلا شبہ ان کے انتقال سے اردو ادب کو بہت بڑا نقصان پہنچا ہے۔ ہمارے ادب کی یہ بدقسمتی ہے کہ اس کے کہنہ مشق اور مسلم الثبوت ادیب اور شاعر ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے ہیں۔ ایک ایسے دور میں جب کہ "ترقی پسند ادب" زبان و بیان کو الٹی چھری سے ذبح کرنے پر تلا ہوا ہے فرحت جیسے فصیح و لطیف اسلوب کے مالک ادیب کا دم بسا غنیمت تھا۔ مرحوم بڑی خوبیوں کے آدمی تھے بہت خوش

اخلاق، بذلہ سنج اور لطیفہ گو تھے۔ خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندوں کو صبر جمیل عطا کرے۔

اخبار" رہبر"

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں

یہ خبر انتہائی حزن و ملال کے ساتھ سنی جائے گی کہ اردو کے مایۂ ناز ادیب میرزا فرحت اللہ بیگ کا آج صبح انتقال ہوا۔ اردو ادب کے لئے یہ ایک ناقابل تلافی نقصان ہے مرحوم اردو کے مستند اور بلند پایہ ظرافت اور طنز نگار ادیب تھے۔

ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ مرحوم کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

اخبار" میزان"

آہ میرزا فرحت اللہ بیگ

یہ خبر انتہائی حزن و ملال کے ساتھ سنی کہ ملک کے ایک مشہور ادیب اور ظرافت نگار میرزا فرحت اللہ بیگ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ گزشتہ چند برس ہیں ہندوستان سے ایسے ایسے قابل ادیب اٹھ گئے کہ اب ان کی جگہ پر ہوتی نظر نہیں آتی' جو دو ایک بچ گئے تھے ان میں میرزا صاحب کا دم بہت غنیمت تھا۔ افسوس ہے کہ یہ شمع بھی بالآخر گل ہو گئی۔

شگفتگی، سلاست اور لطیف مزاح میرزا صاحب کی طرز تحریر کی خصوصیات تھیں اور اس میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ دہلی کا آخری مشاعرہ، العظمت للہ ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی، میرزا صاحب کے شاہکار ہیں۔ آپ کے مزاحیہ مضامین "مضامین فرحت" کی سات جلدوں پر مشتمل ہیں ابھی ابھی چند دنوں قبل آپ نے نشرگاہ حیدرآباد سے ایک تقریر نشر کی تھی کسے معلوم تھا کہ یہ آپ کی آخری تقریر ہو گی۔

مختصر یہ کہ میرزا صاحب کا انتقال دنیائے اردو کے حق میں ایک سانحہ ہے۔ دعا ہے کہ خدا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

حیدرآباد کا ایک روزانہ اخبار

یادِ فرحت

بساطِ بزمِ نظم و نثر کی روحِ رواں تھا وہ
سخن ہے گر جسد جسمِ سخن میں مثلِ جاں تھا وہ

رہیں گے زندہ نغمے ہیں ادب کی محفلیں جب تک
بقا کے ساز پر گویا سرورِ جاوداں تھا وہ

نظر بے باک تھی بے لاگ تھی تنقید فن اس کی
ہنر مند اور ہنر مندوں کا دل سے قدرداں تھا وہ

نفس جب تک رہا سینے میں جاری تھی نوا سنجی
نوائے سوز و سازِ زندگی کا رازداں تھا وہ

نہ جویا مال و دولت کا نہ طالب جاہ و ثروت کا
متاعِ لفظ و معنی کے لیے ہر سو رواں تھا وہ

غمِ دنیا بھلا دیتا تھا ہر مضمون فرحت کا
کچھ ایسا خوش مزاج انساں کچھ ایسا خوش بیاں تھا وہ

عوارض میں صحت والوں سے بڑھ کر صاحبِ ہمت
بڑھاپے میں جوانوں سے زیادہ نوجواں تھا وہ

بہت کم جمع ہوتی ہیں کسی میں خوبیاں اتنی
کہ اہلِ علم و دانش اہلِ دل اہلِ زباں تھا وہ

محبت اس کی یاد آئے گی یکساں دوست دشمن کو
فدا تھا دوستوں پر دشمنوں پر مہرباں تھا وہ

فضل الرحمٰن

ماتمِ فرحت

بانیٔ اردو مجلس کی یاد میں

آہ اس مجلس میں ماتم بانیٔ مجلس کا ہے
اس بھری مجلس میں غم تا بانیٔ مجلس کا ہے

ماتمِ غالب ہے تازہ اور غمِ حالی ہے آج
فرحت اللہ بیگ سے بزمِ ادب خالی ہے آج

مٹ گئی تہذیبِ دہلی کی وہ رنگیں یادگار
جس کی ایک ایک بات میں پنہاں تھے افسانے ہزار

جس کو آنکھیں ڈھونڈتی ہیں یاں وہ زندہ دل نہیں
ہائے وہ محفل کہ جس میں رونق محفل نہیں

ہو گیا دنیا سے رخصت وہ انوکھا حسن کار
آہ کتنی یادگاروں کی مٹی ہے یادگار!

اے ادیبِ خوش بیاں، اے شاعرِ فرحت نواز
سرمدی نغموں سے تھا معمور تیرا سوز و ساز

آہ اس مجلس کی رونق ایک تیرے دم سے تھی
روحِ مجلس گرم تیری کوششِ پیہم سے تھی

دعوتِ مجلس بہانہ تھی ترے احباب کو
ڈھونڈتے رہتے جو تیری دید کے اسباب کو

کیسے کیسے لوگ کھچ کھچ کر چلے آتے تھے یاں
کس قدر تھا سحر آگیں تیرا اسلوبِ بیاں

کس طرح دہرائیں تیرے صفت تیری خوبیاں
تیرے ہر انداز سے انداز مشرق تھا عیاں

تجھ پہ اے اہلِ زباں! ہندوستاں کو ناز تھا ⠀⠀ تیری گویائی پہ خود اُردو زباں کو ناز تھا

گلشنِ رنگیں، ترے افکار برساتے رہے ⠀⠀ زندگی کے تلخ صدمے تو نے ہنس ہنس کر سہے

تیرے زرّیں کارنامے کس قدر جاں بخش ہیں ⠀⠀ تیری اُردو مجلسوں کے نقش دل پر نقش ہیں

"دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیٔ محفل کی یاد
جل چکا حاصل، مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد!"

بشیر النساء بیگم بشیر